تدبرِ قرآن

۲۸

القصص

بسم اللہ الرحمن الرحیم

۱۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق

یہ سورہ سابق سورہ — نمل — کا مثنیٰ ہے۔ اس وجہ سے دونوں کے عمود میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے۔ البتہ اجمال و تفصیل اور اسلوب بیان و نہج استدلال کے اعتبار سے دونوں میں فرق ہے۔ سابق سورہ میں حضرت موسیٰؑ کی سرگزشت کا صرف اتنا حصہ اجمالاً بیان ہوا ہے جو ان کو رسالت عطا کیے جانے اور فرعون کے پاس جانے کے حکم سے متعلق ہے۔ اس سورہ میں وہ پوری سرگزشت، نہایت تفصیل سے بیان ہوئی ہے، جو ان کی ولادت باسعادت سے لے کر ان کو تورات عطا کیے جانے تک کے احوال و مشاہدات پر مشتمل ہے۔ سابق سورہ میں بنی اسرائیل کی طرف صرف ایک مخفی اشارہ تھا، اس سورہ میں ان کے صالحین و مفسدین دونوں کا رویہ نسبۃً وضاحت سے زیر بحث آیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں یہود کھل کر سامنے آگئے تھے۔

حضرت موسیٰؑ کی سرگزشت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بعینہٖ اسی مقصد سے سنائی گئی ہے جس مقصد سے سورۂ یوسف میں حضرت یوسفؑ کی سرگزشت سنائی گئی ہے کہ اس آئینہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی اچھی طرح دیکھ لیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں کی حفاظت و صیانت اور اپنی اسکیموں کو بروئے کار لانے کے لیے اپنی کیا شانیں دکھاتا ہے اور آپ کے مخالفین بھی دیکھ لیں کہ اس دعوت کی مخالفت میں بالآخر ان کو کس انجام سے دوچار ہونا ہے۔

قریش پر اس سورہ میں یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ جس طرح اللہ نے حضرت موسیٰؑ کو فرعون اور اس کی قوم کی طرف رسول بنا کر بھیجا تھا اسی طرح اس نے اس پیغمبر اور اس کتاب کو تمہاری طرف بھیجا ہے تاکہ تم پر اللہ کی ہدایت پوری طرح واضح ہو جائے اور تمہارے پاس گمراہی پر جمے رہنے کے لیے کوئی عذر باقی نہ رہ جائے۔

بنی اسرائیل پر یہ حقیقت واضح فرمائی ہے کہ اگر یہ (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے رسول نہ ہوتے تو کس طرح ممکن تھا کہ حضرت موسیٰؑ کی زندگی کے ان گوشوں سے بھی یہ واقف ہوتے جن سے تم بھی صحیح صحیح اور اس تفصیل سے واقف نہیں ہو اور ساتھ ہی اس امر واقعی کی طرف بھی اشارہ فرمایا ہے کہ جو ہدایت، اللہ نے تم پر نازل فرمائی تھی وہ تم نے اختلافات میں پڑ کر گم کر دی اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے یہ چاہا کہ اپنے اس رسول کے ذریعہ سے اس ہدایت کو از سر نو زندہ کرے اور خلق پر اپنی حجت تمام کرے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس میں یہ تسلی دی گئی ہے کہ اس قرآن کو تم نے اللہ سے مانگ کر نہیں لیا ہے بلکہ

اللہ نے خود تم پر اس کی ذمہ داریاں ڈالی ہیں تو جب اس نے خود تم پر اس کا بار ڈالا ہے تو تم مخالفوں کی مخالفت اور راہ کی مشکلات سے بے پروا ہو کر اپنا فرض انجام دو۔ جس اللہ نے یہ بوجھ تم پر ڈالا ہے وہ خود ہر قدم پر تمھاری رہنمائی و دست گیری فرمائے گا اور تمھیں کامیابی کی منزل پر پہنچائے گا۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

(۱-۴۳) حضرت موسیٰ کی سرگزشت ان کی ولادت با سعادت کے وقت سے لے کر تورات کے عطا کیے جانے تک۔

(۴۴-۴۷) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف التفات جس میں یہ حقیقت واضح فرمائی گئی ہے کہ تم حضرت موسیٰ کی زندگی کے ان مراحل و مقامات سے واقف نہیں تھے لیکن اللہ تعالیٰ نے تم کو ان سے واقف کیا کہ تمھارے ذریعہ سے اللہ کی ہدایت و شریعت دنیا میں پھر زندہ ہو۔ یہ اللہ کا تمھارے اوپر بھی فضل ہے اور تمھاری اس قوم پر بھی جس کے اندر اب تک کوئی رسول نہیں آیا تھا۔ اللہ نے یہ چاہا کہ ان کو کوئی سزا دینے سے پہلے تمھارے ذریعہ سے ان پر اپنی حجت تمام کر دے۔

(۴۸-۵۵) قریش کی طرف سے اس دعوتِ حق کی مخالفت اور اشرارِ یہود کی شہ پر یہ مطالبہ کہ اگر آپ اللہ کے رسول ہیں تو اس طرح کے معجزے کیوں نہیں دکھاتے جس قسم کے معجزے حضرت موسیٰ نے دکھلائے؟ اس معارضہ کا مسکت جواب اور ساتھ ہی ان اچھے اہل کتاب کی تحسین جو اپنی قوم کے تمام غوغا کے علی الرغم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کی دعوت کی تائید کر رہے تھے۔

(۵۶-۶۱) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی اور قریش کے اس اندیشہ کا جواب کہ اگر وہ اس دعوت کو قبول کر لیں گے تو اس سے ان کی تمام سیاست و معیشت تباہ ہو جائے گی۔

(۶۲-۷۵) ان شرکا و شفعاء کی بے حقیقتی کی وضاحت جن کو مشرکین اپنی تمام کامیابیوں کا ذریعہ سمجھتے اور ڈرتے تھے کہ اگر ان کو انھوں نے چھوڑا تو ان پر تباہی آ جائے گی۔

(۷۶-۸۴) ایک یہودی سرمایہ دار کے انجام کا بیان جس سے مقصود اس حقیقت کو واضح کرنا ہے کہ نعمتیں جو بھی ملتی ہیں سب خدا کی طرف سے ملتی ہیں لیکن بدبخت لوگ ان کو اپنی قابلیت کا ثمرہ اور اپنے فرضی معبودوں کا فضل و کرم سمجھتے ہیں۔

(۸۵-۸۸) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو صبر و عزیمت کی تلقین کہ تم اپنے موقف حق پر ڈٹے رہو، مخالفین کے غوغا کی پروا نہ کرو۔ جس خدا نے تم پر قرآن کی دعوت کی ذمہ داری ڈالی ہے وہ تمھاری راہ کی ہر مشکل آسان کرے گا۔

سُورَةُ الْقَصَصِ (۲۸)

مَكِّيَّةٌ —————— اٰيَاتُهَا ۸۸

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

آيات ۱-۴۶

طٰسٓمّٓ ﴿۱﴾ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ﴿۲﴾ نَتْلُوْا عَلَيْكَ مِنْ
نَّبَاِ مُوْسٰى وَفِرْعَوْنَ بِالْحَقِّ لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۳﴾ اِنَّ فِرْعَوْنَ
عَلَا فِى الْاَرْضِ وَجَعَلَ اَهْلَهَا شِيَعًا يَّسْتَضْعِفُ طَآئِفَةً مِّنْهُمْ
يُذَبِّحُ اَبْنَآءَهُمْ وَيَسْتَحْىٖ نِسَآءَهُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ مِنَ
الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۴﴾ وَنُرِيْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِى
الْاَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ اَئِمَّةً وَّنَجْعَلَهُمُ الْوٰرِثِيْنَ ﴿۵﴾ وَنُمَكِّنَ
لَهُمْ فِى الْاَرْضِ وَنُرِىَ فِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ وَجُنُوْدَهُمَا مِنْهُمْ مَّا
كَانُوْا يَحْذَرُوْنَ ﴿۶﴾ وَاَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اُمِّ مُوْسٰٓى اَنْ اَرْضِعِيْهِ ۚ فَاِذَا
خِفْتِ عَلَيْهِ فَاَلْقِيْهِ فِى الْيَمِّ وَلَا تَخَافِىْ وَلَا تَحْزَنِىْ ۚ اِنَّا
رَآدُّوْهُ اِلَيْكِ وَجَاعِلُوْهُ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۷﴾ فَالْتَقَطَهٗٓ اٰلُ
فِرْعَوْنَ لِيَكُوْنَ لَهُمْ عَدُوًّا وَّحَزَنًا ؕ اِنَّ فِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ وَجُنُوْدَهُمَا
كَانُوْا خٰطِـِٕيْنَ ﴿۸﴾ وَقَالَتِ امْرَاَتُ فِرْعَوْنَ قُرَّتُ عَيْنٍ لِّىْ وَ
لَكَ ؕ لَا تَقْتُلُوْهُ ۖ عَسٰٓى اَنْ يَّنْفَعَنَآ اَوْ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا وَّهُمْ لَا

يَشْعُرُوْنَ ﴿٩﴾ وَاَصْبَحَ فُؤَادُ اُمِّ مُوْسٰى فٰرِغًا ؕ اِنْ كَادَتْ لَتُبْدِيْ
بِهٖ لَوْلَاۤ اَنْ رَّبَطْنَا عَلٰى قَلْبِهَا لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿١٠﴾ وَقَالَتْ
لِاُخْتِهٖ قُصِّيْهِ ۫ فَبَصُرَتْ بِهٖ عَنْ جُنُبٍ وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ۙ ﴿١١﴾
وَحَرَّمْنَا عَلَيْهِ الْمَرَاضِعَ مِنْ قَبْلُ فَقَالَتْ هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰۤى اَهْلِ
بَيْتٍ يَّكْفُلُوْنَهٗ لَكُمْ وَهُمْ لَهٗ نٰصِحُوْنَ ﴿١٢﴾ فَرَدَدْنٰهُ اِلٰۤى
اُمِّهٖ كَيْ تَقَرَّ عَيْنُهَا وَلَا تَحْزَنَ وَلِتَعْلَمَ اَنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّلٰكِنَّ
اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿١٣﴾ وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَاسْتَوٰۤى اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا
وَّعِلْمًا ؕ وَكَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُحْسِنِيْنَ ﴿١٤﴾ وَدَخَلَ الْمَدِيْنَةَ عَلٰى
حِيْنِ غَفْلَةٍ مِّنْ اَهْلِهَا فَوَجَدَ فِيْهَا رَجُلَيْنِ يَقْتَتِلٰنِ ۗ هٰذَا مِنْ
شِيْعَتِهٖ وَهٰذَا مِنْ عَدُوِّهٖ ۚ فَاسْتَغَاثَهُ الَّذِيْ مِنْ شِيْعَتِهٖ
عَلَى الَّذِيْ مِنْ عَدُوِّهٖ ۙ فَوَكَزَهٗ مُوْسٰى فَقَضٰى عَلَيْهِ ۗ قَالَ هٰذَا
مِنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ عَدُوٌّ مُّضِلٌّ مُّبِيْنٌ ﴿١٥﴾ قَالَ رَبِّ اِنِّيْ ظَلَمْتُ
نَفْسِيْ فَاغْفِرْ لِيْ فَغَفَرَ لَهٗ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴿١٦﴾ قَالَ رَبِّ
بِمَاۤ اَنْعَمْتَ عَلَيَّ فَلَنْ اَكُوْنَ ظَهِيْرًا لِّلْمُجْرِمِيْنَ ﴿١٧﴾ فَاَصْبَحَ
فِي الْمَدِيْنَةِ خَآئِفًا يَّتَرَقَّبُ فَاِذَا الَّذِي اسْتَنْصَرَهٗ بِالْاَمْسِ
يَسْتَصْرِخُهٗ ؕ قَالَ لَهٗ مُوْسٰۤى اِنَّكَ لَغَوِيٌّ مُّبِيْنٌ ﴿١٨﴾ فَلَمَّاۤ اَنْ
اَرَادَ اَنْ يَّبْطِشَ بِالَّذِيْ هُوَ عَدُوٌّ لَّهُمَا ۙ قَالَ يٰمُوْسٰۤى اَتُرِيْدُ اَنْ
تَقْتُلَنِيْ كَمَا قَتَلْتَ نَفْسًۢا بِالْاَمْسِ ۖ اِنْ تُرِيْدُ اِلَّاۤ اَنْ تَكُوْنَ جَبَّارًا

فِي الْاَرْضِ وَمَا تُرِيْدُ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْمُصْلِحِيْنَ ﴿۱۹﴾ وَجَآءَ رَجُلٌ
مِّنْ اَقْصَا الْمَدِيْنَةِ يَسْعٰى ۫ قَالَ يٰمُوْسٰٓى اِنَّ الْمَلَاَ يَاْتَمِرُوْنَ بِكَ
لِيَقْتُلُوْكَ فَاخْرُجْ اِنِّيْ لَكَ مِنَ النّٰصِحِيْنَ ﴿۲۰﴾ فَخَرَجَ مِنْهَا خَآئِفًا
يَّتَرَقَّبُ ۫ قَالَ رَبِّ نَجِّنِيْ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۲۱﴾ وَلَمَّا تَوَجَّهَ تِلْقَآءَ
مَدْيَنَ قَالَ عَسٰى رَبِّيْٓ اَنْ يَّهْدِيَنِيْ سَوَآءَ السَّبِيْلِ ﴿۲۲﴾ وَلَمَّا وَرَدَ مَآءَ
مَدْيَنَ وَجَدَ عَلَيْهِ اُمَّةً مِّنَ النَّاسِ يَسْقُوْنَ ۫ وَوَجَدَ مِنْ دُوْنِهِمُ
امْرَاَتَيْنِ تَذُوْدٰنِ ۚ قَالَ مَا خَطْبُكُمَا ۭ قَالَتَا لَا نَسْقِيْ حَتّٰى يُصْدِرَ
الرِّعَآءُ ٚ وَاَبُوْنَا شَيْخٌ كَبِيْرٌ ﴿۲۳﴾ فَسَقٰى لَهُمَا ثُمَّ تَوَلّٰٓى اِلَى الظِّلِّ فَقَالَ
رَبِّ اِنِّيْ لِمَآ اَنْزَلْتَ اِلَيَّ مِنْ خَيْرٍ فَقِيْرٌ ﴿۲۴﴾ فَجَآءَتْهُ اِحْدٰىهُمَا
تَمْشِيْ عَلَى اسْتِحْيَآءٍ ۫ قَالَتْ اِنَّ اَبِيْ يَدْعُوْكَ لِيَجْزِيَكَ اَجْرَ مَا
سَقَيْتَ لَنَا ۭ فَلَمَّا جَآءَهٗ وَقَصَّ عَلَيْهِ الْقَصَصَ ۙ قَالَ لَا تَخَفْ ڣ
نَجَوْتَ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۲۵﴾ قَالَتْ اِحْدٰىهُمَا يٰٓاَبَتِ اسْتَاْجِرْهُ ۡ
اِنَّ خَيْرَ مَنِ اسْتَاْجَرْتَ الْقَوِيُّ الْاَمِيْنُ ﴿۲۶﴾ قَالَ اِنِّيْٓ اُرِيْدُ اَنْ
اُنْكِحَكَ اِحْدَى ابْنَتَيَّ هٰتَيْنِ عَلٰٓى اَنْ تَاْجُرَنِيْ ثَمٰنِيَ حِجَجٍ ۚ فَاِنْ
اَتْمَمْتَ عَشْرًا فَمِنْ عِنْدِكَ ۚ وَمَآ اُرِيْدُ اَنْ اَشُقَّ عَلَيْكَ ۭ
سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۲۷﴾ قَالَ ذٰلِكَ بَيْنِيْ وَ
بَيْنَكَ ۭ اَيَّمَا الْاَجَلَيْنِ قَضَيْتُ فَلَا عُدْوَانَ عَلَيَّ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰى مَا
نَقُوْلُ وَكِيْلٌ ﴿۲۸﴾ فَلَمَّا قَضٰى مُوْسَى الْاَجَلَ وَسَارَ بِاَهْلِهٖٓ اٰنَسَ

مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ نَارًا ۚ قَالَ لِاَهْلِهِ امْكُثُوْٓا اِنِّيْٓ اٰنَسْتُ نَارًا لَّعَلِّيْٓ
اٰتِيْكُمْ مِّنْهَا بِخَبَرٍ اَوْ جَذْوَةٍ مِّنَ النَّارِ لَعَلَّكُمْ تَصْطَلُوْنَ ﴿٢٩﴾ فَلَمَّآ
اَتٰىهَا نُوْدِيَ مِنْ شَاطِئِ الْوَادِ الْاَيْمَنِ فِي الْبُقْعَةِ الْمُبٰرَكَةِ مِنَ
الشَّجَرَةِ اَنْ يّٰمُوْسٰٓى اِنِّيْٓ اَنَا اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٣٠﴾ وَاَنْ اَلْقِ عَصَاكَ ؕ
فَلَمَّا رَاٰهَا تَهْتَزُّ كَاَنَّهَا جَآنٌّ وَّلّٰى مُدْبِرًا وَّلَمْ يُعَقِّبْ ؕ يٰمُوْسٰٓى اَقْبِلْ
وَلَا تَخَفْ ۣ اِنَّكَ مِنَ الْاٰمِنِيْنَ ﴿٣١﴾ اُسْلُكْ يَدَكَ فِيْ جَيْبِكَ تَخْرُجْ
بَيْضَآءَ مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ ۫ وَّاضْمُمْ اِلَيْكَ جَنَاحَكَ مِنَ الرَّهْبِ فَذٰنِكَ
بُرْهَانٰنِ مِنْ رَّبِّكَ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ىِٕهٖ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا
فٰسِقِيْنَ ﴿٣٢﴾ قَالَ رَبِّ اِنِّيْ قَتَلْتُ مِنْهُمْ نَفْسًا فَاَخَافُ اَنْ يَّقْتُلُوْنِ ﴿٣٣﴾
وَاَخِيْ هٰرُوْنُ هُوَ اَفْصَحُ مِنِّيْ لِسَانًا فَاَرْسِلْهُ مَعِيَ رِدْاً يُّصَدِّقُنِيْٓ ۫
اِنِّيْٓ اَخَافُ اَنْ يُّكَذِّبُوْنِ ﴿٣٤﴾ قَالَ سَنَشُدُّ عَضُدَكَ بِاَخِيْكَ
وَنَجْعَلُ لَكُمَا سُلْطٰنًا فَلَا يَصِلُوْنَ اِلَيْكُمَا ۚۛ بِاٰيٰتِنَآ ۚۛ اَنْتُمَا وَ
مَنِ اتَّبَعَكُمَا الْغٰلِبُوْنَ ﴿٣٥﴾ فَلَمَّا جَآءَهُمْ مُّوْسٰى بِاٰيٰتِنَا بَيِّنٰتٍ
قَالُوْا مَا هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّفْتَرًى وَّمَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِيْٓ اٰبَآىِٕنَا
الْاَوَّلِيْنَ ﴿٣٦﴾ وَقَالَ مُوْسٰى رَبِّيْٓ اَعْلَمُ بِمَنْ جَآءَ بِالْهُدٰى مِنْ
عِنْدِهٖ وَمَنْ تَكُوْنُ لَهٗ عَاقِبَةُ الدَّارِ ؕ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿٣٧﴾
وَقَالَ فِرْعَوْنُ يٰٓاَيُّهَا الْمَلَاُ مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرِيْ ۚ فَاَوْقِدْ لِيْ
يٰهَامٰنُ عَلَى الطِّيْنِ فَاجْعَلْ لِّيْ صَرْحًا لَّعَلِّيْٓ اَطَّلِعُ اِلٰٓى اِلٰهِ مُوْسٰى ۙ

وَإِنِّي لَأَظُنُّهُ مِنَ الْكَاذِبِينَ ﴿۳۸﴾ وَاسْتَكْبَرَ هُوَ وَجُنُودُهُ فِي الْأَرْضِ
بِغَيْرِ الْحَقِّ وَظَنُّوا أَنَّهُمْ إِلَيْنَا لَا يُرْجَعُونَ ﴿۳۹﴾ فَأَخَذْنَاهُ وَ
جُنُودَهُ فَنَبَذْنَاهُمْ فِي الْيَمِّ ۖ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ
الظَّالِمِينَ ﴿۴۰﴾ وَجَعَلْنَاهُمْ أَئِمَّةً يَدْعُونَ إِلَى النَّارِ ۖ وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ
لَا يُنْصَرُونَ ﴿۴۱﴾ وَأَتْبَعْنَاهُمْ فِي هَٰذِهِ الدُّنْيَا لَعْنَةً ۖ وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ
هُمْ مِنَ الْمَقْبُوحِينَ ﴿۴۲﴾ وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ مِنْ بَعْدِ
مَا أَهْلَكْنَا الْقُرُونَ الْأُولَىٰ بَصَائِرَ لِلنَّاسِ وَهُدًى وَرَحْمَةً
لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ ﴿۴۳﴾ وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الْغَرْبِيِّ إِذْ قَضَيْنَا
إِلَىٰ مُوسَى الْأَمْرَ وَمَا كُنْتَ مِنَ الشَّاهِدِينَ ﴿۴۴﴾ وَلَٰكِنَّا أَنْشَأْنَا
قُرُونًا فَتَطَاوَلَ عَلَيْهِمُ الْعُمُرُ ۚ وَمَا كُنْتَ ثَاوِيًا فِي أَهْلِ مَدْيَنَ
تَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِنَا وَلَٰكِنَّا كُنَّا مُرْسِلِينَ ﴿۴۵﴾ وَمَا كُنْتَ
بِجَانِبِ الطُّورِ إِذْ نَادَيْنَا وَلَٰكِنْ رَحْمَةً مِنْ رَبِّكَ لِتُنْذِرَ قَوْمًا
مَا أَتَاهُمْ مِنْ نَذِيرٍ مِنْ قَبْلِكَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ ﴿۴۶﴾

ع ۴

ترجمۂ آیات ۱-۴۶

یہ طٰسٓمٓ ہے یہ واضح کتاب الٰہی کی آیات ہیں۔ ہم تمہیں موسیٰؑ اور فرعون کی سرگزشت کا
کچھ حصہ ٹھیک ٹھیک سناتے ہیں ان لوگوں کی ہدایت کے لیے جو ایمان لانا چاہیں۔ ۱-۳
بے شک فرعون سرزمین مصر میں بہت سرکش ہو گیا تھا۔ اور اس نے اس کے باشندوں کو
مختلف طبقوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ ان میں سے ایک گروہ کو اس نے دبا رکھا تھا۔ ان کے بیٹوں
کو ذبح کر چھوڑتا اور ان کی عورتوں کو زندہ رکھتا، بے شک وہ زمین میں فساد برپا کرنے والوں

میں سے تھا۔ اور ہم یہ چاہتے تھے کہ ان لوگوں پر احسان کریں جو ملک میں دبا کر رکھے گئے تھے اور ان کو پیشوا بنائیں اور ان کو وراثت بخشیں اور ان کو زمین میں اقتدار عطا کریں اور فرعون و ہامان اور ان کی فوجوں کو ان کے ہاتھوں وہ دکھائیں جس کا وہ اندیشہ رکھتے تھے۔ ۴-۶

اور ہم نے موسیٰ کی ماں کو وحی کی کہ اس کو دودھ پلاؤ، پس جب تمہیں اس باب میں اندیشہ ہو تو اس کو دریا میں ڈال دیجیو اور نہ اندیشہ کیجیو اور نہ غم۔ ہم اس کو تمہارے پاس لوٹا کر لائیں گے اور اس کو اپنے رسولوں میں سے بنانے والے ہیں۔ ۷

تو فرعون کے گھر والوں نے اس کو اٹھا لیا کہ وہ ان کے لیے دشمن اور باعثِ غم بنے۔ بے شک فرعون و ہامان اور ان کے اہلِ لشکر سے بڑی چوک ہوئی۔ اور فرعون کی بیوی نے کہا، یہ میری اور تمہاری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔ اس کو قتل نہ کرو۔ کیا عجب کہ یہ ہم کو نفع پہنچائے یا ہم اس کو بیٹا ہی بنا لیں اور ان کو انجام کی کچھ خبر نہ تھی۔ ۸-۹

اور موسیٰ کی ماں کا دل بالکل بے چین ہو گیا۔ قریب تھا کہ وہ اس کے راز کو ظاہر کر دیتی اگر ہم اس کے دل کو نہ سنبھالتے کہ وہ اہلِ ایمان میں سے بنی رہے۔ اور اس نے اس کی بہن سے کہا کہ تو اس کے پیچھے پیچھے جا تو وہ اس کو دور سے دیکھتی رہی اور ان لوگوں کو اس کی خبر نہ ہونے پائی۔ ۱۰-۱۱

اور ہم نے اس کو پہلے ہی سے دودھ پلائیوں کے دودھ سے روک دیا تھا تو اس نے کہا کیا میں ایک ایسے گھر والوں کا آپ لوگوں کو پتہ دوں جو آپ لوگوں کی خاطر اس کو پالیں گے اور وہ اس کی بڑی خیر خواہی سے دیکھ بھال کریں گے! پس ہم نے اس کو اس کی ماں کی طرف لوٹا دیا کہ اس کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں اور وہ غم نہ کھائے اور تاکہ وہ اچھی طرح جان لے

کہ اللہ کا وعدہ پورا ہو کے رہتا ہے لیکن اکثر لوگ اس حقیقت کو نہیں جانتے۔ ۱۲-۱۳

پس جب وہ اپنی جوانی کو پہنچا اور پورا ہوا تو ہم نے اس کو قوتِ فیصلہ عطا فرمائی اور علم بخشا اور خوب کاروں کو ہم اسی طرح صلہ دیتے ہیں۔ ۱۴

اور ایک دن لوگوں کی بے خبری میں وہ شہر میں داخل ہوا تو اس میں اس نے دو آدمیوں کو لڑتے پایا۔ ایک اس کے اپنے گروہ میں سے تھا اور دوسرا اس کے دشمنوں کے گروہ میں سے۔ تو جو اس کے گروہ میں سے تھا اس نے اس سے اس شخص کے مقابل میں مدد کی درخواست کی جو اس کے مخالفوں میں سے تھا تو موسیٰ نے اس کے گھونسا مارا اور اس کا کام تمام کر دیا۔ اس نے کہا یہ تو مجھ سے شیطانی کام صادر ہو گیا، بے شک وہ ایک کھلا ہوا گمراہ کرنے والا دشمن ہے۔ اس نے دعا کی، اے میرے رب! میں نے اپنی جان پر ظلم ڈھایا تو مجھے بخش دے۔ تو خدا نے اسے بخش دیا۔ بے شک وہ بڑا ہی بخشنے والا مہربان ہے۔ اس نے کہا، اے رب! چونکہ تو نے مجھ پر فضل فرمایا تو میں عہد کرتا ہوں کہ میں مجرموں کا مددگار کبھی نہیں بنوں گا۔ ۱۵-۱۷

پس دوسرے دن وہ شہر میں داخل ہوا ڈرتا، ٹوہ لیتا ہوا، تو دیکھا کہ وہی شخص، جو کل اس سے طالبِ مدد ہوا تھا، آج پھر اس کو مدد کے لیے پکار رہا ہے۔ موسیٰ نے کہا، تم خود ایک کھلے ہوئے شریر آدمی ہو۔ پس جب اس نے ارادہ کیا کہ پکڑے اس کو جو ان دونوں کا دشمن تھا تو وہ بول اٹھا کہ اے موسیٰ، کیا تم آج مجھے قتل کرنا چاہتے ہو جس طرح تم نے کل ایک شخص کو قتل کیا! تم تو اس ملک میں ایک جبار بننے کا ارادہ کر رہے ہو، تم اصلاح کرنے والوں میں سے نہیں بننا چاہتے۔ ۱۸-۱۹

اور شہر کے پرلے سرے سے ایک شخص بھاگا ہوا آیا۔ اس نے بتایا کہ اے موسیٰ

اعیانِ حکومت تمہارے قتل کے مشورے کر رہے ہیں۔ تو یہاں سے نکل جاؤ، میں تمہارے خیر خواہوں میں سے ہوں۔ تو وہ وہاں سے ڈرتا اور ٹوہ لیتا ہوا نکل کھڑا ہوا اور اس نے دعا کی، اے رب! مجھے ظالموں کی قوم سے نجات دے۔ ۲۰-۲۱

اور جب اس نے مدین کا رخ کیا تو اس نے دعا کی، امید ہے کہ میرا رب میری رہنمائی سیدھی راہ کی طرف فرمائے گا۔ اور جب وہ مدین کے کنویں پر پہنچا تو اس نے اس پر لوگوں کی ایک بھیڑ دیکھی جو اپنے جانوروں کو پانی پلا رہے تھے اور ان سے ورے دو عورتوں کو دیکھا جو اپنی بکریاں کو روکے کھڑی ہیں۔ اس نے ان سے پوچھا تمہارا کیا ماجرا ہے؟ انھوں نے کہا، ہم اس وقت تک پانی نہیں پلاتے جب تک چرواہے اپنی بکریاں ہٹا نہ لیں اور ہمارے باپ بہت بوڑھے ہیں۔ تو اس نے ان دونوں کی خاطر پانی پلایا پھر سائے کی طرف ہٹ گیا اور دعا کی، اے میرے رب! جو خیر بھی اس وقت تو میرے لیے اتارے میں اس کا حاجت مند ہوں۔ ۲۲-۲۴

پس ان میں سے ایک شرماتی ہوئی آئی۔ کہا کہ میرے باپ آپ کو بلاتے ہیں کہ آپ نے ہماری خاطر جو پانی پلایا اس کا آپ کو صلہ دیں۔ تو جب وہ اس کے پاس آیا اور اس کو سارا ماجرا سنایا، اس نے کہا، اب اندیشہ نہ کرو، تم نے ظالموں سے نجات پائی۔ ۲۵

ان میں سے ایک نے کہا، ابا جان! ان کو ملازم رکھ لیجیے۔ کیونکہ آپ کے لیے بہترین ملازم وہی ہو سکتا ہے جو قوی اور امانت دار ہو۔ ۲۶

اس نے کہا میں چاہتا ہوں کہ اپنی ان دونوں لڑکیوں میں سے ایک کا نکاح تمہارے ساتھ اس شرط پر کر دوں کہ تم آٹھ سال میری ملازمت کرو۔ اور اگر تم نے دس سال پورے کر دیے تو یہ بات تمہاری مرضی سے ہوگی۔ میں تم پر کوئی مشقت ڈالنا نہیں چاہتا۔ ان شاء اللہ تم مجھے

ایک بھلا آدمی پاؤ گے۔ اس نے جواب دیا کہ یہ بات میرے اور آپ کے درمیان طے ہے۔ دونوں میں سے جو مدت بھی پوری کر دوں تو اس معاملے میں مجھ پر کوئی جبر نہ ہوگا اور اللہ ہمارے اس قول و قرار پر، جو ہم کر رہے ہیں، گواہ ہے۔ ۲۷-۲۸

تو جب موسیٰ نے مدت پوری کر دی اور اپنے اہل کے ساتھ روانہ ہوا تو اس نے طور کی جانب سے ایک آگ دیکھی۔ اس نے اپنے اہل سے کہا، مجھے آگ نظر آئی ہے، تم لوگ ٹھہرو کہ میں وہاں سے کوئی خبر یا آگ کا کوئی انگارا لاؤں تاکہ تم لوگ تاپو۔ ۲۹

تو جب وہ اس کے پاس آیا، خطۂ مبارک میں، وادئ ایمن کے کنارے سے، درخت سے اس کو آواز آئی کہ اے موسیٰ! میں اللہ، عالم کا خداوند ہوں۔ اور یہ کہ تم اپنا عصا ڈال دو تو جب اس نے اس کو اس طرح حرکت کرتے دیکھا گویا سانپ ہو تو وہ پیٹھ پھیر کر بھاگا اور پھر مڑ کے نہ دیکھا۔ اے موسیٰ! آگے آؤ اور ڈرو نہیں، تم بالکل مامون ہو۔ تم اپنا ہاتھ گریبان میں ڈالو وہ بغیر کسی مرض کے سفید نکلے گا اور سکیڑ لو اپنا بازو جس طرح خوف سے سکیڑ لیتے ہیں۔ پس یہ تیرے رب کی جانب سے دو نشانیاں ہیں فرعون اور اس کے درباریوں کے پاس جانے کے لیے۔ بے شک وہ بڑے ہی نافرمان لوگ ہیں۔ ۳۰-۳۲

اس نے کہا، اے رب! میں نے ان میں سے ایک آدمی کو قتل کیا ہے تو میں ڈرتا ہوں کہ وہ مجھے قتل کر دیں گے۔ اور میرے بھائی، ہارون مجھ سے زیادہ فصیح اللسان ہیں تو ان کو بھی میرے ساتھ مددگار کی حیثیت سے بھیج کہ وہ میری تائید کریں۔ میں ڈرتا ہوں کہ وہ لوگ مجھے جھٹلا دیں گے۔ ارشاد ہوا کہ ہم تمھارے بھائی کو بھی تمھارے لیے قوت بازو بنائیں گے اور تم دونوں کو خاص دبدبہ عطا کریں گے تو وہ تم پر دست درازی نہ کر سکیں گے تو ہماری نشانیوں

کے ساتھ جاؤ، تم دونوں اور جو تمھاری پیروی کریں گے، غالب رہو گے۔ ۳۲-۳۵

تو جب موسیٰ ان کے پاس ہماری نہایت واضح نشانیوں کے ساتھ آیا تو انھوں نے کہا، یہ تو محض گھڑا ہوا جادو ہے اور ہم نے اس طرح کی باتیں اپنے اگلوں میں تو سنی نہیں! ۳۶

اور موسیٰ نے کہا، میرا رب خوب جانتا ہے اس کو جو اس کی طرف سے ہدایت لے کر آیا ہے اور جس کے لیے دار آخرت کا انجام خیر ہے۔ ظالم ہرگز فلاح پانے والے نہیں بنیں گے۔ ۳۷

اور فرعون نے کہا، اے درباریو! میں تو تمھارے لیے اپنے سوا کسی اور معبود سے واقف نہیں تو اے ہامان! تم مٹی کی اینٹوں کا پزاوہ لگواؤ اور میرے لیے ایک اونچا محل بنواؤ کہ میں موسیٰ کے خدا کو جھانک کر دیکھوں، میں تو اس کو ایک جھوٹا آدمی خیال کرتا ہوں۔ ۳۸

اور اس نے اور اس کی فوجوں نے زمین میں ناحق گھمنڈ کیا اور انھوں نے گمان کیا کہ ان کو ہماری طرف لوٹنا نہیں ہے تو ہم نے اس کو اور اس کی فوجوں کو پکڑا۔ پس ان کو سمندر میں پھینک دیا تو دیکھو، ظالموں کا انجام کیسا ہوا! اور ہم نے ان کو دنیا میں جہنم کی طرف دعوت دینے والے پیشوا بنایا اور قیامت کے دن ان کی کوئی مدد نہ ہو گی اور اس دنیا میں ہم نے ان کے پیچھے لعنت لگا دی ہے اور قیامت کے دن وہی خوار ہونے والوں میں سے ہوں گے۔ ۳۹-۴۲

اور ہم نے اگلی امتوں کو ہلاک کرنے کے بعد موسیٰ کو کتاب عطا کی لوگوں کے لیے بصیرتیں بخشنے والی اور ہدایت و رحمت بنا کر تاکہ وہ یاددہانی حاصل کریں۔ ۴۳

اور تم تو نہ پہاڑ کے جانب غربی میں موجود تھے جب کہ ہم نے موسیٰؑ کو اپنے فیصلہ سے آگاہ کیا اور نہ تم انہی لوگوں میں تھے جو وہاں موجود تھے لیکن ہم نے بہت سی قومیں اٹھائیں تو ان پر ایک زمانہ گزر گیا (اور وہ ہماری یاددہانی کو بھلا بیٹھے) تو ہم نے تم کو رسول بنایا کہ ان کو

یاددہانی کرو) اور تم اہلِ مدین میں بھی ہماری آیتیں سناتے مقیم نہ تھے لیکن ہم تم کو ایک رسول بنانے والے تھے (سو ہم نے ان احوال سے تم کو باخبر کیا) اور تم طور کے پہلو میں بھی موجود نہ تھے جب کہ ہم نے موسیٰ کو پکارا لیکن تم اپنے رب کی رحمت سے (مبعوث کیے گئے کہ تم) ایک ایسی قوم کو ہشیار کرو جن کے پاس تم سے پہلے کوئی ہشیار کرنے والا نہیں آیا تاکہ وہ یاددہانی حاصل کریں۔ ۴۴-۴۶

۱- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

طٰسٓمّٓ ۝ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ (۱-۲)

حروف مقطعات پر پیچھے بحث گزر چکی ہے۔ 'کتاب مبین' کے اندر احسان و امتنان اور اتمام حجت کے جو پہلو ہیں، خاص طور پر اہل کتاب کے لیے، ان کی وضاحت بھی ان کے محل میں ہو چکی ہے۔ کم و بیش انہی الفاظ سے سابق سورہ کی تمہید بھی شروع ہوئی ہے۔ یہ اس بات کا واضح قرینہ ہے کہ دونوں کا مرکزی مضمون ایک ہی ہے۔

نَتْلُوْا عَلَيْكَ مِنْ نَّبَاِ مُوْسٰى وَفِرْعَوْنَ بِالْحَقِّ لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ (۳)

موسیٰؑ و فرعون کی سرگزشت سنانے کا اصل مقصد

خطاب اگرچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے لیکن آیت کے آخری الفاظ 'لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ' خود شاہد ہیں کہ مقصود اس سرگزشت کے سنانے سے وقت کے فراعنہ یعنی قریش کے لیڈروں کے کان کھولنا ہے۔ 'بِالْحَقِّ' یعنی بالکل ٹھیک ٹھیک، غایت و مدعا اور عبرت و موعظت کے ساتھ۔ تورات میں حضرت موسیٰؑ اور فرعون کی سرگزشت نہ تو ٹھیک ٹھیک بیان ہوئی ہے اور نہ اس سے وہ موعظت ہی سامنے آتی ہے جو اس کی اصل روح ہے۔ قرآن نے یہ سرگزشت اس کے ان دونوں پہلوؤں کو سامنے رکھ کر سنائی ہے۔ 'لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ' میں فعل ہمارے نزدیک ارادۂ فعل کے مفہوم میں ہے۔ یہ ٹکڑا اپنے اندر ایک قسم کی تنبیہ رکھتا ہے کہ ہم یہ سرگزشت سنا تو رہے ہیں لیکن اس کا فائدہ انہی کو پہنچے گا جن کے اندر ایمان لانے کا ارادہ پایا جاتا ہے۔ جو اندھے بہرے بن چکے ہیں وہ بدستور اندھے بہرے ہی بنے رہیں گے۔

اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِى الْاَرْضِ وَجَعَلَ اَهْلَهَا شِيَعًا يَّسْتَضْعِفُ طَآئِفَةً مِّنْهُمْ يُذَبِّحُ اَبْنَآءَهُمْ وَيَسْتَحْىٖ نِسَآءَهُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ (۴)

سرگزشت سے پہلے اس کا خلاصہ

اصل سرگزشت سے پہلے یہ اور اس کے بعد کی دو آیتیں اس غایت و مقصد کو سامنے کر دینے کے لیے

وارد ہوئی ہیں جس کو پیش نظر رکھ کر یہ سنائی جا رہی ہے۔ قرآن میں یہ اسلوب متعدد مقامات میں اختیار کیا گیا ہے کہ کوئی سرگزشت سنانے سے پہلے وہ مدعا مختصر الفاظ میں قاری کے سامنے رکھ دیا جاتا ہے جو اس کے سنانے سے پیش نظر ہوتا ہے تاکہ سرگزشت کے پھیلاؤ میں اصل حقیقت قاری کی نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے پائے۔ سورۂ کہف میں اس کی مثال گزر چکی ہے۔

'اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِی الْاَرْضِ'۔ زمین میں 'علو' (سرکشی) یہ ہے کہ زمین کے اصل خالق و مالک کی مرضی اور اس کے احکام کو نظر انداز کر کے کوئی اس میں اپنی من مانی کرنے لگ جائے اور خدا کے بندوں کو خدا کی بندگی و اطاعت میں داخل کرنے کے بجائے ان سے اپنی بندگی و غلامی کرانے لگے۔

'وَجَعَلَ اَهْلَهَا شِيَعًا يَّسْتَضْعِفُ طَآئِفَةً مِّنْهُمْ' یہ اسی 'علو' اور 'فساد فی الارض' کی وضاحت ہے کہ اس نے ملک کے باشندوں کو طبقات میں تقسیم کیا اور ان میں سے ایک گروہ کو اس نے بالکل دبا کر اور غلام بنا کر رکھا۔ جب راعی و رعیت سب خدا کی مملوک ہیں تو کسی ملک کے حکمران کے لیے یہ بات جائز نہیں ہو سکتی کہ وہ رعایا کے درمیان کوئی تفریق و امتیاز برتے بلکہ راعی و رعیت سب کے لیے بلا امتیاز ایک ہی قانون اور ایک ہی نظام عدل و مساوات ہونا چاہیے لیکن فرعون نے بنی اسرائیل کو تو غلاموں کی حیثیت دے رکھی تھی اور خود خدا بن بیٹھا تھا۔ ساتھ ہی اپنی قوم قبطیوں کو یہ اختیار دے رکھا تھا کہ وہ بنی اسرائیل سے غلاموں کی طرح کام لیں۔

'يُذَبِّحُ اَبْنَآءَهُمْ وَيَسْتَحْيٖ نِسَآءَهُمْ' اس جبر و ظلم کی ایک مثال ہے جو فرعون اور قبطیوں کے ہاتھوں بنی اسرائیل پر ہو رہا تھا۔ بنی اسرائیل کے لڑکوں کو قتل کرنے کی سنگدلانہ اسکیم فرعون اور اس کے اعیان نے جس سیاسی اندیشہ کی بنا پر چلائی تھی اس کی وضاحت سورۂ طٰہٰ اور بعض پچھلی دوسری سورتوں میں ہو چکی ہے۔

'اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ' یعنی یہ خدا کی زمین میں فساد برپا کرنے والوں میں سے تھا درآنحالیکہ اللہ اپنی زمین میں جس کو بھی حکمرانی کا منصب بخشتا ہے عدل و امن کے قیام کے لیے بخشتا ہے۔

وَنُرِيْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِی الْاَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ اَئِمَّةً وَّنَجْعَلَهُمُ الْوٰرِثِيْنَ (۵)

بنی اسرائیل کو پیشوائی دینے کا خدائی فیصلہ

'نُرِيْدُ' سے پہلے، عربی زبان کے معروف قاعدے کے مطابق، فعل ناقص محذوف ہے۔ مطلب یہ ہے کہ فرعون اور اس کے اعیان تو یہ ظلم و ستم ڈھائے ہوئے تھے اور ان کی پوری کوشش یہ تھی کہ وہ بنی اسرائیل کو کسی طرح ابھرنے نہ دیں لیکن ہمارا ارادہ یہ تھا کہ ہم مظلوموں پر احسان کریں، ان کو پیشوائی کا منصب بخشیں اور ظالموں کو مٹا کر مظلوموں کو وراثت و خلافت عطا کریں۔ 'نَجْعَلَهُمْ اَئِمَّةً' سے اشارہ اس دینی پیشوائی کی طرف ہے جو حضرت موسیٰؑ کی بعثت کے بعد بنی اسرائیل کو حاصل ہوئی۔ اور

'نَجْعَلَهُمُ الْوٰرِثِيْنَ' سے خلافت و حکومت مراد ہے جو ان کو ارضِ فلسطین میں ملی، اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے عہد میں جس کے حدود نہایت وسیع ہو گئے یہاں تک کہ مصر کی حکومت بھی ان کی ایک باجگزار ریاست بن گئی۔

وَنُمَكِّنَ لَهُمْ فِي الْأَرْضِ وَنُرِيَ فِرْعَوْنَ وَهَامَانَ وَجُنُودَهُمَا مِنْهُمْ مَا كَانُوا يَحْذَرُونَ (۶)

بنی اسرائیل کو اقتدار دینے کا خدائی فیصلہ

'تمکین فی الارض' سے مراد اقتدار و صولت و دبدبہ ہے۔ یعنی ارادۂ الٰہی یہ ہوا کہ ان دبائے ہوئے مظلوموں کو ایک مضبوط اور طاقت ور سلطنت عطا کرے اور فرعون و ہامان اور ان کی فوجوں کو وہ چیز دکھا دے جس کا وہ اندیشہ رکھتے تھے۔ 'مَا كَانُوا يَحْذَرُونَ' سے اشارہ فرعون اور اس کے اعیان کے اس اندیشہ کی طرف ہے جس کی وضاحت ہم اس کے محل میں کر چکے ہیں کہ وہ بنی اسرائیل کی تعداد میں روز افزوں اضافہ سے بہت خائف تھے کہ اگر یہ قوت پکڑ گئے تو یا تو وہ خود ملک پر قابض ہو جائیں گے یا باہر کے دشمنوں سے مل کر یہاں سے قبطیوں کو بے دخل کر دیں گے۔ اسی خطرے کے سدباب کے لیے ان احمقوں نے بنی اسرائیل کے ذکور کے قتل کی وہ اسکیم بنائی تھی جس کی پوری تفصیل ہم پچھلی سورتوں میں پیش کر چکے ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی اسکیم کے مقابل میں ان کی ساری اسکیمیں اور پیش بندیاں بالکل بیکار ثابت ہوئیں۔ ارادۂ الٰہی مظلوموں کے حق میں پورا ہو کے رہا اور ان کے دشمن تمام زور و سطوت اور تمام تدبیر و تدبر کے باوجود پامال ہوئے۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ اسی حقیقت کو قریش کے اکابر و زعما کے سامنے رکھنے کے لیے وہ سرگزشت سنائی جا رہی ہے جو آگے آ رہی ہے تاکہ لوگ اس قصہ کو قصہ کی حیثیت سے نہیں بلکہ اس حق کو مدِ نظر رکھ کر سنیں جو اس کے اندر مضمر ہے۔

ہامان فرعون کا وزیر تھا

یہاں بالکل پہلی مرتبہ فرعون کے ساتھ 'ہامان' کا ذکر بھی آیا ہے اور اس طرح آیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی حیثیت فرعون کے وزیر کی تھی اور اس کو بنی اسرائیل کو دبائے رکھنے کے مسئلہ سے خاص دلچسپی تھی۔ آگے بھی اس کا ذکر فرعون کے وزیر اعظم ہی کی حیثیت سے آ رہا ہے۔ تورات میں یہ نام نہیں آیا ہے لیکن اس سے کوئی خاص فرق نہیں پیدا ہوتا۔ کتنی باتیں ہیں جن میں قرآن نے تورات کے بیانات کی تصحیح کی ہے یا ان پر اضافہ کیا ہے۔ یہ بھی حضرت موسیٰؑ اور فرعون کی سرگزشت میں ایک قیمتی اضافہ ہے۔ بعض مستشرقین نے اس نام کو اعتراض کا ہدف بنایا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ مصر میں اس نام کا کوئی شخص نہیں تھا۔ ان لال بجھکڑوں کا یہ اعتراض بالکل ہی احمقانہ ہے۔ کیا یہ حضرات یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ ان کو فرعون اور اس کے تمام وزراء و اعیان اور اس عہد کے تمام اکابر مصر کے ناموں کی فہرست مل گئی ہے؟ وزراء و اعیان تو در کنار کیا یہ حضرات خود اس فرعون کے بارے میں متفق اللفظ ہیں جو حضرت موسیٰؑ کا ہم عصر تھا؟ قرآن کی مخالفت کے جنون میں اس قسم کی باتیں جو یہ

لوگ کہتے ہیں وہ بالکل ہی ناقابلِ التفات ہیں۔ یہ لوگ پائی ہوئی حقیقت کو گم کرنے میں تو بڑے ماہر ہیں۔ لیکن جب کسی چیز کا سراغ دیتے ہیں تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے مڈے کی ٹانگ پر ہاتھی کا خول چڑھایا ہے۔

بنی اسرائیل کے اندیشے فرعون کی فوجی تیاریاں

یہاں فرعون و ہامان کے ساتھ ساتھ خاص طور پر ان کی فوجوں کا جو ذکر بار بار آیا ہے اس کی بھی ایک خاص وجہ ہے۔ اس عہد کی تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ فرعون اور اس کے اعیان نے بنی اسرائیل کے مسئلہ کو ایک بالکل سیاسی رنگ دے دیا تھا۔ ان کی کثرتِ تعداد کو وہ اپنی حکومت کے لیے ایک خطرہ سمجھتے تھے۔ اس وجہ سے فرعون نے اپنے تمام امراء و اعیان کو یہ حکم دے رکھا تھا کہ وہ اپنے اپنے علاقوں میں اپنی فوجوں کو بنی اسرائیل کے خطرے سے نمٹنے کے لیے بالکل چوکس رکھیں، چنانچہ جب اس نے بنی اسرائیل کے تعاقب کا فیصلہ کیا تو اپنے تمام امراء اور والیوں کو ان کی فوجوں سمیت طلب کیا۔ فرعون کو اپنی ان افواج پر، جیسا کہ قرآن اور تورات دونوں سے واضح ہوتا ہے بڑا ناز تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کا یہ سارا غرور و ناز چشم زدن میں ختم کر دیا۔

وَاَوۡحَيۡنَاۤ اِلٰۤى اُمِّ مُوۡسٰۤى اَنۡ اَرۡضِعِيۡهِ‌ ۚ فَاِذَا خِفۡتِ عَلَيۡهِ فَاَلۡقِيۡهِ فِى الۡيَمِّ وَلَا تَخَافِىۡ وَلَا تَحۡزَنِىۡ‌ ۚ اِنَّا رَآدُّوۡهُ اِلَيۡكِ وَجَاعِلُوۡهُ مِنَ الۡمُرۡسَلِيۡنَ (۷)

اصل سرگزشت کا آغاز

اب یہ اصل سرگزشت شروع ہوئی ہے کہ جب حضرت موسیٰؑ کی ولادت ہوئی تو فرمایا کہ ہم نے موسیٰ کی ماں کو وحی کی کہ اس کو دودھ پلاتی رہو۔ اگر تمھیں کوئی اندیشہ ہو تو اس کو دریا میں ڈال دیجیو اور ذرا فکر و غم نہ کیجیو، ہم اس کو تمھارے پاس واپس لائیں گے اور اس کو اپنے رسولوں میں سے بنائیں گے۔

'وحی' سے مراد یہاں ظاہر ہے کہ وہ اصطلاحی وحی نہیں ہے جو حضرات انبیائے کرام علیہم السلام کے ساتھ مخصوص ہے۔ بلکہ الہام و القاء یا رؤیا کے ذریعہ سے اس طرح دل میں کوئی بات ڈال دینا ہے جس سے دل کو اس پر فی الجملہ اطمینان ہو جائے۔

حضرت موسیٰؑ کی حفاظت کے لیے خدائی انتظامات

جس زمانے میں حضرت موسیٰؑ کی ولادت ہوئی ہے بنی اسرائیل کے بچوں کے ہلاک کرنے کی سکیم بڑے زوروں سے چل رہی تھی۔ اول اول تو یہ کام فرعون اور اس کے اعیان نے دائیوں سے لینا چاہا لیکن تورات سے معلوم ہوتا ہے کہ دائیوں نے اس میں کچھ زیادہ تعاون نہیں کیا۔ بالآخر فرعون نے قبطیوں کو یہ عام حکم دیا کہ بنی اسرائیل کے ہاں جو اولادِ نرینہ پیدا ہو اس کو دریا میں پھینک دیا کریں۔ اسی خطرناک زمانے میں حضرت موسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے۔ اس وجہ سے قدرتی طور پر ان کی والدہ ماجدہ کا دل ہر وقت دھڑکتا رہتا کہ معلوم نہیں کس وقت کسی ظالم کی نظر بچے پر پڑ جائے اور وہ اس کو اچک لے جائے۔ اسی خطرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ ابھی تو تم اس کو دودھ پلاؤ۔ اگر اس طرح کا کوئی خطرہ محسوس ہو تو بے خوف و خطر بچے کو تم خود اپنے ہاتھوں دریا کے حوالہ کر دینا اور ذرا غم و فکر نہ کرنا۔ ہم اس کو

تمھارے پاس واپس بھی لائیں گے اور اس کو مستقبل میں اپنے شرفِ رسالت سے بھی مشرف کریں گے۔ دریا میں ڈالنے کی یہ ہدایت ظاہر ہے کہ اس وجہ سے فرمائی گئی کہ فرعون نے جو راستہ بچوں کی ہلاکت کے لیے اختیار کیا تھا اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ حضرت موسیٰؑ کے لیے وہی راستہ نجات کا راستہ بنے۔ سورۂ طٰہٰ کی آیت ۳۹ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ایک صندوق میں بچے کو رکھ کے صندوق کو دریا میں بہا دینے کی ہدایت ہوئی تھی۔ تورات میں یہ واقعہ یوں بیان ہوا ہے۔

"وہ عورت حاملہ ہوئی اور بیٹا جنی اور اس نے اسے خوب صورت دیکھ کے تین مہینے تک چھپا رکھا اور جب آگے اس کو نہ چھپا سکی تو سرکنڈوں کا ایک ٹوکرا بنایا اور اس پر لاسا اور رال لگایا اور لڑکے کو اس میں رکھا اور اس نے اسے دریا کے کنارے پر جھاڑ میں رکھ دیا۔"

تورات کے بیان میں جو کمیاں اور غلطیاں ہیں ان کی طرف سورۂ طٰہٰ اور سورۂ اعراف کی تفسیر میں ہم اشارہ کر چکے ہیں۔ یہاں خاص چیز جو قابلِ توجہ ہے وہ یہ ہے کہ حضرت موسیٰؑ کی والدہ ماجدہ کو الہام کے ذریعہ سے یہ تسلی دے دی گئی تھی کہ اس بچے کو ہم تمھارے پاس پھر واپس لائیں گے اور اس کو منصبِ رسالت پر سرفراز کریں گے اور یہ تسلی، اسلوبِ کلام دلیل ہے کہ ایک حتمی وعدے کی شکل میں دی گئی تھی۔ یہی چیز تھی جس کے اعتماد پر حضرت موسیٰؑ کی والدہ ماجدہ یہ بازی کھیل گئیں ورنہ کوئی ماں اپنے جگر کے ٹکڑے کو اس طرح دریا کی موجوں کے حوالہ کس طرح کر سکتی ہے!!

فَالْتَقَطَهٗۤ اٰلُ فِرْعَوْنَ لِيَكُوْنَ لَهُمْ عَدُوًّا وَّحَزَنًا ؕ اِنَّ فِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ وَجُنُوْدَهُمَا كَانُوْا خٰطِـِٕيْنَ (۸)

حضرت موسیٰؑ شاہی محل میں

اتنی بات بر بنائے قرینہ یہاں پر محذوف ہے کہ حضرت موسیٰؑ کی والدہ نے جب خطرہ محسوس کیا تو ہدایتِ خداوندی کے مطابق بچے کو سرکنڈے کے ایک صندوق میں رکھ کر صندوق کو دریائے نیل کے حوالہ کر دیا۔ تورات کی مذکورہ بالا روایت پر اعتماد کیجیے تو واقعہ کی تفصیل یہ معلوم ہوتی ہے کہ تین ماہ تک تو انھوں نے بچے کو کسی نہ کسی طرح چھپائے رکھنے کی کوشش کی لیکن بالآخر انھیں یہ اندازہ ہو گیا کہ یہ تدبیر کارگر ہونے والی نہیں ہے۔ چنانچہ ناچار انھیں وہ اقدام کرنا ہی پڑا جس کا ذکر اوپر ہوا۔ دریائے نیل اسرائیلیوں کی بستی کے پاس سے گزرتا ہوا فرعون کے محل کی طرف جاتا تھا۔ وہاں دریا کی موجوں نے صندوق کو کنارے پر ڈال دیا۔ فرعون کے گھر کے لوگوں کی نظر اس پر پڑ گئی۔ انھوں نے جب دیکھا کہ صندوق میں ایک موہنا بچہ پڑا ہوا ہے تو بادشاہ اور ملکہ کے حکم سے بچے کو شاہی محل میں لایا گیا۔ فرعون کی بیوی، جیسا کہ سورۂ تحریم سے واضح ہے، نہایت نیک دل تھیں۔ انھوں نے کہا اس بچے کو قتل نہ کرو، بہت ممکن ہے کہ یہ ہم کو نفع پہنچائے یا ہم اس کو اپنا بیٹا ہی بنا لیں۔ اس طرح حضرت موسیٰؑ شاہی محل میں پہنچ گئے اور بادشاہ اور ملکہ دونوں کی آنکھوں کی ٹھنڈک بن گئے۔ یہاں لفظ 'آل' سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جب

صندوق میں پڑے ہوئے ایک بچے کا ذکر شاہی محل تک پہنچا تو خاندانِ شاہی کے تمام چھوٹے بڑے موقع پر پہنچ گئے اور سب اس کو اٹھا کر محل میں لائے۔

تقدیرِ الٰہی کے بھید کسی کو معلوم نہیں

لِيَكُونَ لَهُمْ عَدُوًّا وَحَزَنًا۔ اس 'ل' کی وضاحت ہم دوسرے مقام میں کر چکے ہیں کہ یہ غایت و انجام کو ظاہر کرنے کے لیے ہے۔ انھوں نے تو بچے کو اس لیے اٹھایا کہ وہ ان کے لیے، جیسا کہ آگے ملکہ کے قول سے واضح ہوگا، آنکھوں کی ٹھنڈک بنے گا لیکن تقدیرِ الٰہی کا یہ بھید ان کو نہیں معلوم تھا کہ اس بچے کے ہاتھوں فرعونی اقتدار کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو جائے گا۔

إِنَّ فِرْعَوْنَ وَهَامَانَ وَجُنُودَهُمَا كَانُوا خَاطِئِينَ۔ یہ فرعون، ہامان اور ان کی فوجوں کے رویے پر عام تبصرہ ہے کہ وہ اپنی حماقت کے سبب سے یہ سمجھے کہ تمام اختیار و اقتدار ان کے ہاتھ میں ہے، وہ بنی اسرائیل کو ہمیشہ اسی طرح دبائے رکھیں گے۔ انھیں کیا خبر تھی کہ اگر خدا چاہے گا تو ان کے سب سے بڑے تابع کی پرورش ان کے شاہی محل میں، خود بادشاہ اور ملکہ کے ہاتھوں کرائے گا! اوپر آیت ۶ کے مضمون پر ایک نظر ڈال لیجیے۔

وَقَالَتِ امْرَأَتُ فِرْعَوْنَ قُرَّتُ عَيْنٍ لِّي وَلَكَ ۖ لَا تَقْتُلُوهُ ۖ عَسَىٰ أَن يَنفَعَنَا أَوْ نَتَّخِذَهُ وَلَدًا وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ (۹)

فرعون کی بیوی نہایت نیک دل تھیں

ملکہ نے جب بچے کو دیکھا تو اس موہنی صورت پر قربان ہو گئیں۔ فرعون سے کہا، یہ تو میری اور تمھاری دونوں کی آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔ اس کو قتل نہ کرو۔ امید ہے یہ ہمیں نفع پہنچائے یا ہم اس کو بیٹا ہی بنا لیں۔ ملکہ کے متعلق دوسرے مقام میں ہم یہ وضاحت کر چکے ہیں کہ یہ نہایت نیک دل اور فرعون کے رویّہ سے سخت بیزار تھیں۔ عَسَىٰ أَن يَنفَعَنَا أَوْ نَتَّخِذَهُ وَلَدًا۔ یہ بعینہٖ وہی بات ہے، جو عزیزِ مصر نے، حضرت یوسفؑ سے متعلق، اپنی بیوی کو خطاب کر کے کہی تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تک ملکہ کے ہاں کوئی اولاد نہیں تھی اور اگر تورات کے بیان کو باور کر لیا جائے کہ جس نے حضرت موسیٰ کے صندوق کو سب سے پہلے دیکھا وہ فرعون کی لڑکی تھی تو یہ ماننا پڑے گا کہ اس وقت تک ان کے ہاں کوئی اولادِ نرینہ نہیں تھی۔ اس وجہ سے انھوں نے اس توقع کا اظہار کیا کہ اول تو اس شکل و صورت کا بچہ فوائد و برکات سے خالی نہیں ہو سکتا، پھر یہ بات بھی ہے کہ اگر کسی اولادِ نرینہ کے لیے ہماری امید پوری نہ ہوئی تو ہم اس کو اپنا بیٹا ہی بنا لیں گے۔ وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ، یعنی بادشاہ اور ملکہ یہ سوچ رہے تھے، انھیں کچھ خبر نہیں تھی کہ قدرت اس پردے میں اپنی کیا شان دکھانے والی ہے!

وَأَصْبَحَ فُؤَادُ أُمِّ مُوسَىٰ فَارِغًا ۖ إِن كَادَتْ لَتُبْدِي بِهِ لَوْلَا أَن رَّبَطْنَا عَلَىٰ قَلْبِهَا لِتَكُونَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ (۱۰)

آزمائش میں اہل ایمان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا معاملہ

حضرت موسیٰؑ کی والدہ نے جب کوئی مفر نہ دیکھا تو جی کڑا کر کے صندوق دریا میں ڈالنے کو تو ڈال دیا لیکن اس کے بعد ان پر جو کچھ گزری یہ اس کی طرف اشارہ ہے کہ ان کا دل صبر و قرار سے بالکل خالی ہوگیا۔ قریب تھا کہ بے صبری میں ان سے کوئی ایسی بات صادر ہو جائے جس سے سارا راز فاش ہو جائے لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو سنبھال لیا تاکہ جس دولتِ ایمان سے وہ بہرہ مند تھیں اس پر اس آزمائش میں بھی وہ ثابت قدم رہیں۔ انسان بہرحال انسان ہے۔ کسی ماں کے لیے خود اپنے ہاتھوں اپنے جگر کے ٹکڑے کو دریا کی موجوں کے حوالہ کر دینا کوئی آسان بازی نہیں ہے۔ اگرچہ ایک اشارۂ غیبی کا سہارا ان کو حاصل تھا اور یہ سہارا نہ ہوتا تو بھلا وہ اس کا تصور بھی کس طرح کر سکتی تھیں تاہم جب اپنا حال یہ ہے کہ اس واقعہ کا تصور کرتے ہوئے معلوم ہوتا ہے کہ دل سینہ سے نکل پڑے گا تو اس وقت حضرت موسیٰؑ کی والدہ کے دل پر جو کچھ گزری ہوگی اس کا اندازہ ان کے رب کے سوا اور کون کر سکتا ہے! لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو اس نازک موقع پر سنبھالا اور وہی سنبھال سکتا تھا۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں اور بندیوں کو امتحان میں تو ڈالتا ہے کہ یہ امتحان اس کی سنت ہے اور یہ امتحان درجے اور مرتبے کے اعتبار سے سخت سے سخت تر بھی ہوتا ہے لیکن ساتھ ہی اس کی یہ سنت بھی ہے کہ جو لوگ اس کے امتحان کی راہ میں بازی کھیل جاتے ہیں وہ ان کو سنبھالتا بھی ہے۔ حضرت موسیٰؑ کی والدہ ماجدہ نے چونکہ بچے کو دریا کی موجوں کے حوالہ کر کے اپنے ایمان و توکل کی شہادت دے دی تھی اس وجہ سے آگے کے مرحلے میں خود ربِّ کریم نے ان کے دل کو سنبھال لیا کہ ان کے اس ایمان و توکل کی لاج قائم رہے، کوئی ایسی بات صادر نہ ہونے پائے جو اس کے منافی ہو۔ اپنے باایمان بندوں اور بندیوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا معاملہ یوں ہی ہے لیکن اس کو بہت کم لوگ سمجھتے ہیں!

وَقَالَتْ لِأُخْتِهِ قُصِّيهِ فَبَصُرَتْ بِهِ عَنْ جُنُبٍ وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ (١١)

دل کی تسلی کے لیے آخری تدبیر

جب صندوق پانی میں بہتا ہوا آگے کو چلا تو انھوں نے حضرت موسیٰؑ کی بہن سے فرمایا کہ اس کے پیچھے پیچھے کنارے کنارے تم بھی جاؤ اور دیکھو کہ صندوق کدھر کو جاتا ہے۔ یہ دل کی تسلی کے لیے آخری تدبیر تھی جو وہ کر سکتی تھیں۔ ظاہر ہے کہ صندوق کا تعاقب ایک خاص حد تک ہی ممکن تھا، بالآخر تو اس کو نگاہوں سے اوجھل ہونا ہی تھا لیکن جتنی دیر بھی اور جتنی دور تک بھی اس کو دیکھنا ممکن ہو سکے وہ اس سے محروم رہنا کس طرح گوارا کر سکتی تھیں! چنانچہ حضرت موسیٰؑ کی بہن دور سے اس طرح اس کو دیکھتی رہیں کہ کسی کو اس واقعہ کی طرف توجہ نہ ہوتی۔ اللہ تعالیٰ کا یہ فضل و احسان ہوا کہ ان کی یہ مہم کامیاب رہی۔ صندوق کا فرعون کے محل کے پاس ساحل پر لگ جانے اور ننھے بھائی کو محل میں لے جانے کا سارا ماجرا انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہی محل اسرائیلیوں کی بستی سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔

وَحَرَّمْنَا عَلَيْهِ الْمَرَاضِعَ مِنْ قَبْلُ فَقَالَتْ هَلْ أَدُلُّكُمْ عَلَىٰ أَهْلِ بَيْتٍ يَكْفُلُونَهُ لَكُمْ

وَهُمْ لَهُ نٰصِحُوْنَ (۱۲)

اللہ تعالیٰ کی ایک اور کارسازی

اب یہ اس تدبیر کا ذکر ہو رہا ہے جو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کو ان کی والدہ کی طرف لوٹانے کے لیے اختیار فرمائی۔ اوپر گزر چکا ہے کہ بچے کو محل میں بڑے چاؤ پیار سے لے جایا گیا۔ ظاہر ہے کہ سب سے پہلے اس بات کی فکر ہوئی ہوگی کہ بچے کو کسی دایہ کا دودھ پلایا جائے۔ دایہ بلائی گئی تو حضرت موسیٰؑ نے اس کا دودھ نہیں پیا۔ دوسری بلائی گئی۔ تیسری بلائی گئی۔ یکے بعد دیگرے کئی دایائیں بلائی گئیں لیکن حضرت موسیٰؑ نے کسی کی چھاتی منہ سے نہیں لگائی۔ اس صورتِ حال سے حضرت موسیٰؑ کی بہن نے فائدہ اٹھایا۔ انھوں نے آگے بڑھ کر کہا اگر آپ لوگ کہیں تو میں ایک ایسے گھر والوں کا پتہ دوں جو پوری خیرخواہی اور محبت کے ساتھ بچے کی غور و پرداخت کریں گے۔ محل والے پریشان تو تھے ہی وہ فوراً راضی ہو گئے اور اس طرح حضرت موسیٰؑ کے اپنی ماں کے آغوش میں پہنچنے کی راہ کھل گئی۔

فَرَدَدْنٰهُ اِلٰٓى اُمِّهٖ كَیْ تَقَرَّ عَیْنُهَا وَلَا تَحْزَنَ وَلِتَعْلَمَ اَنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ (۱۳)

حضرت موسیٰؑ کا ماں کی آغوش میں

اس تدبیر سے خدائے کارساز و کریم نے حضرت موسیٰؑ کو دریا سے نکلوایا اور پھر ان کو ان کی ماں کی گود میں پہنچا دیا تاکہ ان کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں اور ان کا غم دور ہو جائے۔

اصل نکتہ

'وَلِتَعْلَمَ اَنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ' یہ اس وعدے کے ایفاء کی طرف اشارہ ہے جس کا ذکر اوپر آیت ۷ میں گزرا کہ تم بچے کو بے خوف و خطر دریا میں ڈال دینا، ہم اس کی حفاظت کریں گے اور اس کو پھر تم سے ملائیں گے۔ فرمایا کہ اس طرح ہم نے اس کو دکھا دیا کہ ہم جو وعدہ کرتے ہیں، خواہ اس کا ایفا بظاہر کتنا ہی مستبعد کیوں نہ نظر آئے لیکن ہم اس کو پورا کر کے رہتے ہیں اور ہماری تدبیر کبھی ناکام نہیں ہوتی۔ 'وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ' یہ اصل نکتہ کی بات ارشاد ہوئی ہے کہ اکثر لوگ اپنی بلادت کے سبب سے اس حقیقت کو نہیں سمجھتے۔ وہ خدا کے وعدوں کو محض ہوائی باتیں خیال کرتے ہیں اور ان کے اعتماد پر کوئی بازی کھیلنے میں ان کو خسارہ اور خطرہ نظر آتا ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے وعدے پورے ہوتے دیکھ لیں تب مانیں گے حالانکہ اس دنیا میں اصل امتحان تو یہی ہے کہ لوگ اپنے رب کے ان وعدوں اور وعیدوں کے لیے جئیں اور مریں جن کی حقیقت ابھی سامنے آئی ہے۔

وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَاسْتَوٰٓى اٰتَیْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا ؕ وَكَذٰلِكَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ (۱۴)

حضرت موسیٰ کی جوانی کا اصلی جمال

'بَلَغَ اَشُدَّهٗ' سے جوانی کو پہنچنا مراد ہے اور اس کے ساتھ لفظ 'اسْتَوٰى' عقلی و مزاجی اعتدال و توازن کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ یعنی جب حضرت موسیٰ علیہ السلام جسمانی اعتبار سے جوانی کو اور عقلی و مزاجی اعتبار سے اعتدال و توازن کی عمر کو پہنچے۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ جوانی بجائے خود کوئی بڑی وقیع چیز نہیں ہے اگر اس کے ساتھ عقلی و مزاجی اعتدال کا جمال نہ ہو۔

'حکم' سے مراد قوتِ فیصلہ اور 'علم' سے مراد خدا کی معرفت ہے۔ اس حکم و علم کے مختلف مدارج ہیں۔ اس کا اعلیٰ درجہ وہ ہے جو حضرات انبیاء علیہم السلام کو حاصل ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں یہی الفاظ حضرات انبیاء علیہم السلام کے علم کے لیے بھی استعمال ہوئے ہیں لیکن یہاں ظاہر ہے کہ وہ علم و حکمت مراد نہیں ہے اس لیے کہ یہ حضرت موسیٰ کی ابتدائی زندگی کے احوال بیان ہو رہے ہیں۔ نبوت ان کو، جیسا کہ آگے تفصیل آرہی ہے، اس کے بہت بعد ملی ہے۔

فرمایا کہ جب حضرت موسیٰ جوانی کو پہنچے اور ان کی عقل اور ان کے مزاج میں اعتدال و توازن آگیا تو ہم نے ان کو حکمت و معرفت سے نوازا۔ 'وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ' جو لوگ خوب کار ہوتے ہیں ہم ان کو اسی طرح صلہ دیا کرتے ہیں۔ 'مُحْسِنِيْنَ' سے یہاں وہ لوگ مراد ہیں جو اپنی قوتوں اور صلاحیتوں کو ان کے صحیح مصرف میں بالکل صحیح طریقہ پر استعمال کرتے ہیں۔ فرمایا کہ ایسے لوگوں کو ہم اپنے علم و حکمت میں سے حصہ دیتے ہیں۔ یہی علم و حکمت انسان کی قوتوں اور صلاحیتوں کا اصلی جمال و کمال ہے۔ اگر کوئی شخص یہ نہ حاصل کر سکا تو اس نے اپنی ساری صلاحیتیں بھی برباد کیں اور اپنی جوانی بھی غارت کی۔

وَدَخَلَ الْمَدِيْنَةَ عَلٰى حِيْنِ غَفْلَةٍ مِّنْ اَهْلِهَا فَوَجَدَ فِيْهَا رَجُلَيْنِ يَقْتَتِلٰنِ ۖ هٰذَا مِنْ شِيْعَتِهٖ وَهٰذَا مِنْ عَدُوِّهٖ ۚ فَاسْتَغَاثَهُ الَّذِيْ مِنْ شِيْعَتِهٖ عَلَى الَّذِيْ مِنْ عَدُوِّهٖ ۙ فَوَكَزَهٗ مُوْسٰى فَقَضٰى عَلَيْهِ ۖ قَالَ هٰذَا مِنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ ۭ اِنَّهٗ عَدُوٌّ مُّضِلٌّ مُّبِيْنٌ ۔ قَالَ رَبِّ اِنِّيْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ فَاغْفِرْ لِيْ فَغَفَرَ لَهٗ ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ (۱۵-۱۶)

'مدینۃ' سے مراد

'مدینۃ' سے مراد اصل شہر ہے جو شرفا و اعیان کا مرکز اور حکومت کا مستقر تھا۔ بنی اسرائیل کی حیثیت چونکہ محض غلاموں اور خدمت گاروں کی تھی اس وجہ سے ان کی بستی اصل شہر سے الگ بسائی گئی تھی۔ وہ صرف مزدوروں اور خدمت گاروں کی طرح کام کے اوقات میں شہر میں جایا کرتے تھے۔

صالح جوانی میدانِ عمل میں

حضرت موسیٰ علیہ السلام جب جوان ہوئے اور ان کے اندر وہ فتوت و مروّت اور حمیت و غیرت پیدا ہوئی جو صالح جوانی اور علم و معرفت کا خاصہ ہے تو وہ وقتاً فوقتاً شہر میں اپنے مظلوم بھائیوں کا حال دیکھنے کے لیے جانے لگے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی حمیت و حمایت کے سبب سے قبطیوں کی نظروں میں کھٹکنے لگے تھے اس وجہ سے انھیں یہ کام لوگوں کی نگاہوں سے بچ بچا کے ایسے اوقات میں کرنا پڑتا جن میں لوگ آرام کرتے ہیں۔ ایک دن وہ اسی طرح کے تجسس کے لیے شہر میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ ایک قبطی اور ایک اسرائیلی دونوں لڑ رہے ہیں۔ اسرائیلی نے جب حضرت موسیٰ کو دیکھا تو ان سے طالب مدد ہوا۔ حضرت موسیٰ اس کو مظلوم دیکھ کر، بتقاضائے فتوت و حمایت حق، اس کی مدد کے لیے بڑھے اور چاہا کہ بیچ بچاؤ کرا دیں۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ قبطی اپنی رعونت کے سبب سے ان سے الجھ پڑا۔ انھوں نے اپنی مدافعت میں اس کو جو گھونسا مارا تو وہ ایسا بے ڈھب پڑا کہ وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ حضرت موسیٰ نے تو قبطی کے قتل کرنے کا کوئی ارادہ

رکھتے تھے اور نہ ان کو اس صورتِ حال کے پیش آنے کا کوئی گمان تھا۔ بالکل بے ارادہ جب یہ حادثہ پیش آ گیا تو انھیں فوراً اپنی غلطی پر سخت پشیمانی ہوئی اور انھوں نے اپنے رب سے معافی مانگی کہ اے رب میں نے اپنی جان پر سخت ظلم ڈھایا تو مجھے معاف فرما دے۔ چونکہ یہ غلطی ان سے بالکل بے ارادہ ہوئی تھی، پھر انھوں نے معافی بھی بلا تاخیر مانگی، اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کو فوراً ہی معاف فرما دیا اور اس معافی کی غیبی طور پر ان کو بشارت بھی مل گئی۔ اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے۔

اوپر یہ جو ذکر ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کو بھرپور جوانی کے ساتھ اپنی حکمت و معرفت سے بھی نوازا تھا یہ اسی حکمت و معرفت کا کرشمہ ہے۔ اگر حضرت موسیٰؑ صرف ایک نگڑے جوان ہوتے تو اپنے گھونسے کی شہ زوری اور بے پناہی پر فخر سے پھولے نہ سماتے۔ بالخصوص ایک قبطی کے اس طرح قتل کو تو وہ اپنا ایک زندۂ جاوید کارنامہ سمجھتے لیکن انھوں نے اپنے دشمن کے معاملے میں بھی، اپنی ایک غیر ارادی غلطی کو، اپنا ایک جرم سمجھا اور اپنے رب سے اس کی فوراً معافی مانگی۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ یہ معاملہ حضرت موسیٰؑ اور ان کے رب ہی کے درمیان کا معاملہ تھا۔ مصر میں اس وقت جو صورتِ حال تھی اس میں اس بات کا کوئی امکان نہ تھا کہ حضرت موسیٰؑ حکومت اور قانون سے کسی انصاف کی توقع کرتے۔

قَالَ رَبِّ بِمَآ اَنۡعَمۡتَ عَلَیَّ فَلَنۡ اَکُوۡنَ ظَہِیۡرًا لِّلۡمُجۡرِمِیۡنَ (۱۷)

آئندہ کے لیے احتیاط کا عہد

نعمت، صالحین کے لیے شکر گزاری میں اضافہ کرتی ہے اس وجہ سے جب اللہ تعالیٰ نے ان پر یہ فضل فرمایا کہ ان کو معافی دے دی تو آئندہ کے لیے انھوں نے یہ عہد فرمایا کہ اب میں کبھی مجرموں کا مددگار نہ بنوں گا۔ "مجرموں کا مددگار نہ بنوں گا" سے یہ بات لازم نہیں آتی کہ آپ نے اسرائیلی کی حمایت اس کو مجرم سمجھتے ہوئے کی۔ آپ نے تو جو کچھ کیا اس کو مظلوم سمجھتے ہوئے کیا، اس کی فریاد پر کیا اور وقت کے حالات کی بنا پر ان کو گمان یہی ہوا کہ قبطی ظالم اور اسرائیلی مظلوم ہے لیکن جب اللہ تعالیٰ نے ان کے معافی مانگنے پر یہ نہیں فرمایا کہ تم بے قصور ہو، قبطی ظالم آدمی تھا، بلکہ ان کو ایک غلطی کا مرتکب قرار دیتے ہوئے معافی دی تو اس سے وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ معلوم ہوتا ہے کہ میں نے مظلوم کی حمایت کرنی چاہی لیکن معاملہ کی تحقیق نہ کرنے کے سبب سے مجھ سے ظالم کی حمایت صادر ہو گئی۔ اس وجہ سے آئندہ کے لیے آپ نے یہ عہد فرمایا کہ اب میں بلا تحقیق کسی کی حمایت نہیں کروں گا بلکہ صرف اسی کی حمایت کروں گا جس کا مظلوم ہونا معلوم ہو۔ چنانچہ دوسرے ہی دن آپ نے جب اسی اسرائیلی کو ایک دوسرے قبطی سے لڑتے دیکھا اور وہ حسبِ سابق پھر حضرت موسیٰؑ سے طالبِ مدد ہوا تو آپ نے اس کو جھڑک دیا کہ تم ایک شریر آدمی معلوم ہوتے ہو۔

فَاَصۡبَحَ فِی الۡمَدِیۡنَۃِ خَآئِفًا یَّتَرَقَّبُ فَاِذَا الَّذِی اسۡتَنۡصَرَہٗ بِالۡاَمۡسِ یَسۡتَصۡرِخُہٗ ؕ قَالَ لَہٗ مُوۡسٰۤی اِنَّکَ لَغَوِیٌّ مُّبِیۡنٌ (۱۸)

عہد کا احترام

دوسرے روز حضرت موسیٰؑ ڈرتے اور ٹوہ لیتے ہوئے پھر شہر میں داخل ہوئے۔ شہر میں جاتے ہوئے احتیاط تو، جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے، پہلے بھی وہ کرتے تھے لیکن اب اس واقعہ کے سبب سے اور بھی طرح طرح کے اندیشے رہے ہوں گے کہ معلوم نہیں اس کا ردِ عمل ان کے اور ان کی قوم کے خلاف کیا ہوتا ہے نہ زبانوں پر کیا چرچے ہیں اور ان کے بارے میں کیا چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں! اتنے میں دیکھا کہ وہی اسرائیلی جو کل ان سے طالب مدد ہوا تھا آج پھر فریاد کر رہا ہے۔ لیکن حضرت موسیٰؑ نے اس کو جھڑک دیا کہ تم خود ایک کھلے ہوئے شریر آدمی معلوم ہوتے ہو۔ اس کے کھلے ہوئے شریر آدمی ہونے کی ایک کھلی ہوئی دلیل تو یہی تھی کہ کل بھی وہ ایک شخص سے الجھا ہوا تھا جس کے نتیجہ میں ایک سنگین حادثہ پیش آ چکا تھا اور آج بھی ایک دوسرے شخص سے وہ لڑ رہا تھا۔ یہ واضح قرینہ اسی بات کا تھا کہ یہ شخص شر پسند ہے۔ اور دوسری وجہ وہ تھی جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا کہ حضرت موسیٰؑ نے اللہ تعالیٰ کی معافی سے بھی یہی نتیجہ اخذ کیا کہ اسرائیلی کو مظلوم سمجھ کر اس کی حمایت کرنے میں ان سے غلطی صادر ہوئی، اس معاملے میں ان کو تحقیق کرنی تھی۔ چنانچہ انھوں نے اللہ تعالیٰ سے یہ وعدہ جو فرمایا تھا کہ آئندہ میں کسی مجرم کی پشت پناہی نہیں کروں گا اس موقع پر انھوں نے اس کا پورا احترام ملحوظ رکھا۔ اس مرتبہ وہ فوراً اس کی حمایت کے لیے نہیں اٹھ کھڑے ہوتے بلکہ قرائن کو سامنے رکھ کر اسی کو تنبیہ کی کہ تم خود ایک جھگڑالو اور شریر آدمی معلوم ہوتے ہو۔

فَلَمَّآ اَنْ اَرَادَ اَنْ يَّبْطِشَ بِالَّذِيْ هُوَ عَدُوٌّ لَّهُمَا ۙ قَالَ يٰمُوْسٰٓى اَتُرِيْدُ اَنْ تَقْتُلَنِيْ كَمَا قَتَلْتَ نَفْسًا ۢ بِالْاَمْسِ ۖ اِنْ تُرِيْدُ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ جَبَّارًا فِي الْاَرْضِ وَمَا تُرِيْدُ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْمُصْلِحِيْنَ (۱۹)

ایک اسلوب کی وضاحت

'اَنْ' سے پہلے یہاں کوئی مناسب موقع فعل محذوف ہے۔ یعنی جب معاملہ یوں ہوا یا جب بات یہاں تک پہنچی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے پہلے زبانی افہام و تفہیم سے فریقین کو ہموار کرنے کی کوشش کی لیکن جب اس سے کام نہ چلا بلکہ قبطی نے کچھ اکڑ دکھائی تو آپ نے اس کو پکڑ کر علیحدہ کرنا چاہا۔ اس قبطی کو یہاں 'عَدُوٌّ لَّهُمَا' سے تعبیر کیا ہے۔ یعنی حضرت موسیٰؑ اور اسرائیلی دونوں کا دشمن۔ اس کی وجہ واضح ہے کہ اسرائیلی کا تو وہ بالفعل دشمن تھا ہی اور حضرت موسیٰؑ کے ساتھ اس کی دشمنی قومی اعتبار سے بھی تھی اور اس پہلو سے بھی کہ وہ اپنی اصلاحی سرگرمیوں کے سبب سے تمام قبطیوں کی نظروں میں کانٹے کی طرح کھٹکنے لگے تھے۔

اسرائیلی کی حماقت سے افشائے راز

حضرت موسیٰؑ نے پکڑنا تو چاہا قبطی کو لیکن انھوں نے پہلے جھڑکا اسرائیلی کو تھا اس وجہ سے اس نے گمان کیا کہ آج ہو نہ ہو ان کا گھونسا اس پر پڑنے والا ہے۔ اس گھبراہٹ میں وہ چلایا کہ کل تم نے ایک شخص کو جس طرح قتل کیا ہے اسی طرح آج معلوم ہوتا ہے کہ تم مجھے قتل کرنا چاہتے ہو۔ اس طرح اس نے اپنی حماقت سے راز کھول دیا۔ بعض لوگوں نے 'يٰمُوْسٰٓى اَتُرِيْدُ' الخ کو قبطی کا قول قرار دیا ہے لیکن یہ قرین قیاس نہیں کیونکہ ایک تو قتل کا واقعہ ابھی راز تھا، دوسرے قبطی حضرت موسیٰؑ کو مصلح نہیں سمجھتے تھے۔

اِنۡ تُرِيۡدُ اِلَّاۤ اَنۡ تَكُوۡنَ جَبَّارًا فِى الۡاَرۡضِ وَمَا تُرِيۡدُ اَنۡ تَكُوۡنَ مِنَ الۡمُصۡلِحِيۡنَ۔

سفلہ لوگوں کا کردار

جَبَّار کے معنی یہاں مطلق العنان اور قابو سے باہر کے ہیں۔ یعنی افشائے راز کے ساتھ ساتھ اس نے حضرت موسیٰؑ پر یہ چوٹ بھی کر ڈالی کہ تم تو یہ گمان کر رہے تھے کہ تم اس ملک میں اصلاح کرنا چاہتے ہو لیکن معلوم ہوا کہ اصلاح نہیں کرنا چاہتے بلکہ ایک بالکل مطلق العنان اور بے قابو آدمی بن کر زندگی بسر کرنا چاہتے ہو۔

اس کے اس قول سے ایک طرف تو سفلہ لوگوں کا کردار سامنے آتا ہے کہ جب تک کوئی شخص ان کی مدد و حمایت کیے وہ اس کو بہت بڑا مصلح سمجھتے ہیں لیکن اگر وہ ان کو کسی برائی سے روکنے کی کوشش کرے تو وہ نہ صرف اس کو ایک بہت بڑا مفسد قرار دیتے ہیں بلکہ اس کے خلاف جاسوسی کرنے والے اور اس کے رازوں کو طشت از بام کرنے والے بھی بن جاتے ہیں۔ دوسری طرف اس سے حضرت موسیٰؑ کا کردار بھی سامنے آتا ہے کہ وہ اسی زمانے سے اپنی قوم کے اندر ایک مصلح اور مرجع امید سمجھے جانے لگے تھے۔

وَجَآءَ رَجُلٌ مِّنۡ اَقۡصَا الۡمَدِيۡنَةِ يَسۡعٰى قَالَ يٰمُوۡسٰٓى اِنَّ الۡمَلَاَ يَاۡتَمِرُوۡنَ بِكَ لِيَقۡتُلُوۡكَ فَاخۡرُجۡ اِنِّىۡ لَـكَ مِنَ النّٰصِحِيۡنَ (۲۰)

مردِ مومن کا کردار

حضرت موسیٰؑ کی ذات تو، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، پہلے ہی سے فرعونیوں کی نظر میں کھٹک رہی تھی لیکن جب یہ واقعہ پیش آگیا اور ایک اسرائیلی ہی کی زبان سے وہ افشا بھی ہو گیا تو قدرتی طور پر فرعونیوں کی آتشِ غضب پوری طرح ان کے خلاف بھڑک اٹھی اور وہ ان کے قتل کے منصوبے بنانے لگے۔

وَجَآءَ رَجُلٌ مِّنۡ اَقۡصَا الۡمَدِيۡنَةِ يَسۡعٰى۔ اصل شہر، جو حکومت اور اعیانِ حکومت کا مرکز تھا، وہ جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، بنی اسرائیل کی بستی سے پرے تھا اس وجہ سے اس کو 'اَقۡصَا الۡمَدِيۡنَةِ' کے الفاظ سے تعبیر کیا ہے۔ فرمایا کہ وہاں سے ایک شخص یہ معلوم کر کے کہ اعیانِ حکومت حضرت موسیٰؑ کے قتل کے مشورے کر رہے ہیں، بھاگا ہوا حضرت موسیٰؑ کو اطلاع دینے آیا کہ آپ کے قتل کے مشورے ہو رہے ہیں۔ میں آپ کا خیر خواہ ہوں اس وجہ سے میرا مشورہ یہ ہے کہ آپ یہاں سے فوراً نکل جائیں۔ اس شخص سے متعلق یہاں کوئی تفصیل مذکور نہیں ہے لیکن سورۂ مومن میں ایک مومنِ آلِ فرعون کا ذکر بڑی تفصیل سے آیا ہے۔ ان کا تعلق شاہی خاندان سے تھا۔ یہ ابتدا ہی سے حضرت موسیٰؑ کے خیر خواہوں میں سے تھے اور بعد کے ادوار میں، جیسا کہ سورۂ مومن میں تفصیل آئے گی، انھوں نے اعیانِ حکومت کے سامنے حضرت موسیٰؑ کی بڑی پرزور حمایت کی۔ اس وجہ سے ظنِ غالب یہ ہے کہ یہ اشارہ بھی انہی کی طرف ہے۔

اِنِّىۡ لَـكَ مِنَ النّٰصِحِيۡنَ۔ یہ صفائی انھوں نے اس وجہ سے پیش کرنی ضروری سمجھی کہ بدگمانی کی اس فضا میں جو اس وقت اسرائیلیوں اور قبطیوں کے درمیان تھی یہ اندیشہ ہو سکتا تھا کہ ممکن ہے حضرت موسیٰؑ یہ خیال کریں کہ ایک فرعونی اس طرح ان کو مرعوب کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ لفظ 'يَسۡعٰى' سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ جونہی ان کو معلوم ہوا کہ معاملہ نہایت سنجیدہ بلکہ خطرناک ہو چکا ہے، وہ اعیانِ حکومت میں سے

ہونے کے باوصف، بھاگے ہوئے حضرت موسیٰؑ کے پاس ان کی بستی میں آئے۔ ان کی یہ سرگرمی ان کی ہمدردی و خیرخواہی کی ایک نہایت اعلیٰ مثال ہے۔

فَخَرَجَ مِنْهَا خَآئِفًا يَّتَرَقَّبُ ۬ قَالَ رَبِّ نَجِّنِيْ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ (۲۱)

اس کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام ڈرتے اور بچتے بچاتے ہوئے مصر سے نکل کھڑے ہوئے اور چونکہ فرعونیوں کی طرف سے تعاقب کا اندیشہ تھا اس وجہ سے انھوں نے یہ دعا فرمائی کہ اے رب مجھے ان ظالموں کے شر سے نجات دے۔

وَلَمَّا تَوَجَّهَ تِلْقَآءَ مَدْيَنَ قَالَ عَسٰى رَبِّيْٓ اَنْ يَّهْدِيَنِيْ سَوَآءَ السَّبِيْلِ (۲۲)

حضرت موسیٰؑ کا قصدِ مدین اور اللہ کی راہ میں کام کرنے والوں کے لیے ایک سبق

اسلوبِ کلام سے یہ بات نکلتی ہے کہ حضرت موسیٰؑ جس وقت مصر سے نکلے ہیں اس وقت انھوں نے اپنے سفر کی منزل متعین نہیں کی تھی۔ یہ فیصلہ انھوں نے بعد میں کیا کہ انھیں مدین کی طرف جانا چاہیے اور مدین کے معاملے میں بھی یہ بات ان کے ذہن میں واضح نہیں تھی کہ انھیں کس کے پاس اور کس مقام پر جانا چاہیے بلکہ بغیر کسی تعین کے مدین کی سمت کو اس امید کے ساتھ چل کھڑے ہوئے کہ رب کریم و کارساز سیدھی راہ کی طرف رہنمائی فرمائے گا اور کسی مستقر پر پہنچائے گا۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ حضرت موسیٰؑ کا یہ نکلنا اس نوعیت کی ہجرت نہیں تھا جس کا مرحلہ ان کی بعثت کے بعد پیش آیا۔ ہجرت کے معاملے میں تو سنتِ الٰہی یہ رہی ہے کہ اس کا وقت بھی اللہ تعالیٰ نے خود مقرر فرمایا ہے اور اس کے تمام مراحل و منازل بھی اپنے رسول پر خود واضح فرماتے ہیں لیکن اس سفر میں حضرت موسیٰؑ کے سامنے اس طرح کی کوئی واضح غیبی رہنمائی نہیں تھی۔ بس متوکلاً علی اللہ وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور ان کے اسی توکل نے ان کی دست گیری و رہنمائی کی۔ اس پہلو سے یہ واقعہ اللہ کے ان تمام بندوں اور بندیوں کے لیے نہایت سبق آموز ہے جن کو حق کی راہ میں کوئی ابتلاء پیش آئے۔ اگر وہ اللہ کے اعتماد پر کوئی قدم اٹھائیں گے تو ان کو خدا کی رہنمائی حاصل ہوگی اگرچہ اس کے لیے ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی واضح بشارت نہ ملی ہو۔

وَلَمَّا وَرَدَ مَآءَ مَدْيَنَ وَجَدَ عَلَيْهِ اُمَّةً مِّنَ النَّاسِ يَسْقُوْنَ ۬ وَوَجَدَ مِنْ دُوْنِهِمُ امْرَاَتَيْنِ تَذُوْدٰنِ ۚ قَالَ مَا خَطْبُكُمَا ؕ قَالَتَا لَا نَسْقِيْ حَتّٰى يُصْدِرَ الرِّعَآءُ ٚ وَاَبُوْنَا شَيْخٌ كَبِيْرٌ (۲۳)

'ماء' سے مراد

'مَآء' سے مراد چشمہ بھی ہو سکتا ہے اور کنواں بھی۔ تورات میں کنویں ہی کا ذکر آیا ہے ویسے پہاڑی چشمے بھی کنووں سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہوتے۔ بالعموم ان تک پہنچنے کے راستے نہایت تنگ ہوتے ہیں اس وجہ سے ان پر پانی پینا اور پلانا کوئی سہل کام نہیں ہوتا بالخصوص جب کہ پانی پینے پلانے والوں کی بھیڑ بھی ہو۔

ایک ماجرا کا حضرت موسیٰؑ پر اثر

حضرت موسیٰؑ مدین پہنچے تو اس کے کنویں یا چشمے پر بیٹھ گئے۔ وہاں انھوں نے دیکھا کہ چرواہوں کی ایک بھیڑ اپنے اپنے گلوں کو پانی پلا رہی ہے اور دو عورتیں اپنے گلے کو روکے ہوئے ان سے پرے

کھڑی ہیں۔ لفظ 'تَذُوْدٰنِ' سے یہ بات نکلتی ہے کہ ان کا گلہ تو گھاٹ پر پہنچ کر پانی پینے کے لیے آگے بڑھنے کے لیے زور لگا رہا ہے لیکن ان بیچاریوں کو زبردستی اس کو پیچھے ہٹانا پڑ رہا ہے۔ انھوں نے ان سے پوچھا کہ تمھارے سامنے کیا مشکل ہے؟ یہاں آکر تم اپنے گلے کو کیوں روکے کھڑی ہو؟ انھوں نے جواب دیا کہ ہمارے باپ بہت بوڑھے ہو چکے ہیں گلے کی دیکھ بھال ہمیں کرنی پڑ رہی ہے اور ہمارے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ اس بھیڑ کے اندر گھس کر اپنے گلے کو پانی پلا سکیں اس وجہ سے ہمیں چرواہوں کے واپس ہونے تک انتظار کرنا پڑتا ہے۔ جب تک وہ اپنے گلے ہٹا نہ لیں ہم اپنے گلے کو پانی نہیں پلا سکتے۔

فَسَقٰى لَهُمَا ثُمَّ تَوَلّٰٓى اِلَى الظِّلِّ فَقَالَ رَبِّ اِنِّیْ لِمَآ اَنْزَلْتَ اِلَیَّ مِنْ خَیْرٍ فَقِیْرٌ (۲۴)

حضرت موسیٰؑ کا جذبۂ حمایتِ ضعیف

ان شریف زادیوں کی یہ بات سن کر حضرت موسیٰؑ کا جذبۂ حمایتِ ضعیف بھڑک اٹھا۔ وہ اٹھے اور ان کی بکریوں کو انھوں نے پانی پلایا۔ اور پانی پلا کر پھر اسی سایہ میں آکر بیٹھ گئے جس کے نیچے بیٹھے ہوئے تھے اور دعا فرمائی کہ اے رب! اس وقت جو چیز بھی تو میرے لیے نازل فرمائے میں اس کا محتاج ہوں۔

چند قابلِ توجہ باتیں

یہاں چند باتیں خاص طور پر قابلِ توجہ ہیں۔

ایک یہ کہ حضرت موسیٰؑ کو یہ بات نہایت اہم محسوس ہوئی کہ دو شریف لڑکیوں کو بکریاں چرانے کا پُرمشقت کام کرنا پڑ رہا ہے اور وہ اس بے بسی کے ساتھ عین گھاٹ کے سامنے اپنی بکریوں کو روکے کھڑی ہیں۔ حضرت موسیٰؑ کے اس احساس کا اظہار ان کے 'مَا خَطْبُكُمَا' کے سوال سے ہو رہا ہے۔ عربی میں لفظ 'خَطْبٌ' کسی امرِ عظیم و اہم ہی کے لیے آتا ہے اس وجہ سے ان کے اس سوال کے اندر یہ بات مضمر ہے کہ تمھیں کیا افتاد اور مشکل پیش آئی ہے کہ بکریوں کی چرواہی کی یہ پُرمشقت خدمت تمھیں انجام دینی پڑ رہی ہے اور تم اس طرح اپنی بکریوں کو یہاں روکے کھڑی ہو؛ صاحبزادیوں نے حضرت موسیٰؑ کے سوال کو بالکل ٹھیک ٹھیک سمجھ کر جواب دیا کہ یہ خدمت ہمیں اس لیے انجام دینی پڑ رہی ہے کہ ہمارے باپ بہت بوڑھے ہیں اور ہم اپنی بکریوں کو اس لیے روکے کھڑی ہیں کہ ہم مردوں کی اس بھیڑ میں نہیں گھس سکتی ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس دور میں بھی عورتوں اور مردوں کے دائرۂ کار الگ الگ سمجھے جاتے تھے اور اگر عورتوں کو کسی مجبوری کے سبب سے کوئی اس طرح کی خدمت انجام دینی ہی پڑتی تھی جو مردوں کے دائرۂ کار سے تعلق رکھنے والی ہو تو اس کو انجام تو دیتی تھیں لیکن محض بربنائے مجبوری اور وہ بھی مردوں کے شانہ بشانہ اور ان کے اندر گھل مل کر نہیں بلکہ پوری احتیاط اور رکھ رکھاؤ کے ساتھ، حتی الامکان مردوں سے الگ تھلگ رہتے ہوئے۔ ایک طرف حضرت شعیبؑ کے زمانے کے اس معاشرتی تصویر کو سامنے رکھیے جس کی شہادت حضرت شعیبؑ کی صاحبزادیوں اور حضرت موسیٰؑ کے اس واقعہ سے ملتی ہے۔ دوسری طرف اپنی قوم کے ان سماجی مصلحین کے دعوے پر غور کیجیے جو کہتے ہیں کہ عورتوں اور مردوں کا دائرۂ کار بالکل ایک ہی ہے اس لیے دونوں کو ہر میدان میں بالکل شانہ بشانہ کام کرنا چاہیے۔ یہ حضرات دلیل تو اپنے

دعوے پر دیہاتوں کی غریب عورتوں کی زندگی سے پیش کرتے ہیں لیکن نتیجہ اس سے شہروں کی بیگمات کے لیے اخذ کرتے ہیں۔

دوسری چیز اس واقعہ میں قابلِ توجہ یہ ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے حمایتِ ضعیف کا حق تو فوراً پوری مستعدی سے ادا کر دیا کہ یہ ان کی فتوت و مروت کا تقاضا تھا لیکن اس کے بعد ایک حرف بھی ان صاحبزادیوں کے سامنے ان کی زبان سے ایسا نہیں نکلا جس سے ان کی کسی پریشانی یا مسافرت یا ضرورت کا اظہار ہو بلکہ جس سایہ سے ان کی مدد کے لیے اٹھے تھے اسی سایہ میں آکر پھر بیٹھ گئے اور اپنے رب سے دعا کی کہ اے رب جس منزل کو سامنے رکھ کر میں نے ادھر کا رخ کیا تھا وہ تو آ گئی۔ اب بس تیرے فضل و رحمت کا انتظار ہے۔ تو جو خیر بھی اس مرحلے میں میرے لیے نازل فرمائے میں اس کا محتاج ہوں۔ اس دعا کی بلاغت کی تعبیر سے زبانِ قلم قاصر ہے۔ صرف اہلِ ذوق ہی اس کو سمجھ سکتے ہیں۔ چونکہ یہ دعا بالکل صحیح وقت پر، صحیح جذبے کے ساتھ اور بالکل صحیح الفاظ میں زبان سے نکلی اس وجہ سے اس کا اثر بلا کسی تاخیر کے ظاہر ہوا۔ صاحبزادیوں نے حضرت موسیٰؑ کے اس احسان کا ذکر اپنے باپ سے کیا اور اس طرح حضرت موسیٰؑ کے لیے اس خیر کی راہ کھل گئی جس کے لیے انھوں نے دعا فرمائی تھی۔

فَجَآءَتْهُ اِحْدٰىهُمَا تَمْشِیْ عَلَی اسْتِحْیَآءٍ ۫ قَالَتْ اِنَّ اَبِیْ یَدْعُوْكَ لِیَجْزِیَكَ اَجْرَ مَا سَقَیْتَ لَنَا ؕ فَلَمَّا جَآءَهٗ وَقَصَّ عَلَیْهِ الْقَصَصَ ۙ قَالَ لَا تَخَفْ ٚ نَجَوْتَ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ (۲۵)

حضرت موسیٰؑ کے لیے خیر کی راہ

حضرت موسیٰؑ ابھی سایہ ہی میں بیٹھے تھے کہ ان میں سے ایک صاحبزادی لجاتی شرماتی ہوئی آئیں اور بولیں کہ آپ کو ہمارے والد ماجد بلاتے ہیں کہ آپ نے ہماری بکریوں کو جو پانی پلایا ہے اس کا آپ کو صلہ دیں۔ تورات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس روز صاحبزادیاں چونکہ معمول کے خلاف وقت سے پہلے فارغ ہو کر گھر پہنچ گئیں اس وجہ سے حضرت شعیبؑ نے ان سے پوچھا کہ آج تم اتنی جلدی کیسے چلی آئیں؟ اس پر انھوں نے بتایا کہ آج ایک مصری نے ہم پر یہ احسان کیا کہ اس نے ہماری بکریوں کو خود بھر کر پانی پلا دیا۔ حضرت شعیبؑ نے اس پر فرمایا تم نے ان کو چھوڑ کیوں دیا؟ جا کر ان کو بلا لاؤ کہ ہمارے ہاں روٹی کھائیں۔ باپ کے حکم کی تعمیل میں ایک صاحبزادی حضرت موسیٰؑ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور بولیں کہ آپ کو ہمارے والد بلاتے ہیں کہ آپ نے ہماری بکریوں کو جو پانی پلایا ہے اس کا صلہ دیں۔ حضرت موسیٰؑ اس وقت اس طرح کی کسی مدد کے نہایت محتاج تھے۔ اس کو انھوں نے ایک تائیدِ غیبی سمجھا اور فوراً اس کے ساتھ ہو لیے۔

شریف بیبیوں کے اطوار

یہاں تَمْشِیْ عَلَی اسْتِحْیَآءٍ کے الفاظ خاص طور پر قابلِ توجہ ہیں۔ اوپر مِنْ دُوْنِهِمُ کے الفاظ سے یہ بات واضح ہے کہ وہ چرواہوں کی بھیڑ سے بالکل الگ کھڑی ہوئی تھیں۔ یہ بات بھی اوپر گزر چکی ہے کہ انھوں نے اپنی اس کنارہ کشی کی علت یہ بیان فرمائی کہ مردوں کی بھیڑ سے بچنے کے لیے انھیں یہ زحمت اٹھانی پڑتی ہے کہ جب تک چرواہے یہاں سے ہٹ نہ جائیں وہ انتظار کرتی ہیں۔ پھر یہاں

فرمایا کہ جب وہ حضرت موسیٰؑ کو بلانے کے لیے آئیں تو شرماتی ہوئی آئیں۔ یعنی یہ نہیں کیا کہ آکر بے دھڑک حضرت موسیٰؑ کے سامنے کھڑی ہو جائیں بلکہ سمٹی سمٹائی، کپڑوں کو سنبھالے اور اپنی احتیاط کی جگہوں کو محفوظ کیے ہوئے آئیں۔ اب سوال یہ ہے کہ واقعہ کی یہ جزئیات قرآن نے اس جزرسی کے ساتھ کیوں بیان فرمائی ہیں؟ اس کا جواب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ قرآن ہر قدم پر یہ نمایاں کرنا چاہتا ہے کہ شریفانہ زندگی کے عادات و اطوار کیا ہیں اور شریف بی بیوں کو مردوں کے معاملے میں کیا رویہ اختیار کرنا چاہیے۔ یہی شریفانہ عادات و اطوار ہیں جن کو قرآن نے ایک ضابطہ کی صورت میں سورۂ نور اور سورۂ احزاب میں ہمارے سامنے رکھ دیا ہے۔ سورۂ نور کی تفسیر میں اس ضابطہ کی وضاحت ہم کر چکے ہیں اور خدا نے چاہا تو احزاب کی تفسیر میں اس کی مزید وضاحت ہو جائے گی۔ یہ امر بھی یہاں ملحوظ رکھیے کہ یہ ان خواتین کے عادات و اطوار بیان ہوئے ہیں جنھیں اپنی بکریوں کی چرواہی کرنی پڑتی تھی۔ تو جب ان کے لیے عند اللہ پسندیدہ روش یہ ہے تو ان خواتین کے لیے پسندیدہ روش کیا ہوگی جن کو اس طرح کی کوئی مجبوری نہیں ہے!

حضرت موسیٰؑ حضرت شعیبؑ کی خدمت میں

فَلَمَّا جَآءَهٗ وَقَصَّ عَلَيْهِ الْقَصَصَ ۙ قَالَ لَا تَخَفْ ۫ نَجَوْتَ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ۔

حضرت شعیبؑ کی اس دعوت پر حضرت موسیٰؑ ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان کو اپنی ساری داستان سنائی۔ حضرت شعیبؑ نے ان کا سارا ماجرا سن کر فرمایا کہ اب تم کوئی اندیشہ نہ کرو۔ خدا نے ظالموں سے تمھیں نجات دی۔ گویا اس طرح حضرت موسیٰؑ کو ان کی اس دعا کی قبولیت کی بشارت مل گئی جو انھوں نے مصر سے نکلتے ہوئے بدیں الفاظ فرمائی تھی۔ رَبِّ نَجِّنِيْ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ۔

قَالَتْ اِحْدٰىهُمَا يٰٓاَبَتِ اسْتَاْجِرْهُ ۡ اِنَّ خَيْرَ مَنِ اسْتَاْجَرْتَ الْقَوِيُّ الْاَمِيْنُ (۲۶)

یہاں 'اِحْدٰىهُمَا' کے اعادے سے یہ بات نکلتی ہے کہ حضرت موسیٰؑ کے حق میں یہ سفارش حضرت شعیبؑ کی دوسری صاحبزادی نے فرمائی۔ اگر انھی نے یہ سفارش کی ہوتی جو ان کو بلانے کے لیے گئی تھیں تو یہاں فاعل کے اعادے کی ضرورت نہیں تھی۔

صاحبِ کردار کے کردار کا اندازہ ایک نظر میں ہو جاتا ہے

حضرت شعیبؑ کو اپنے گلے کی دیکھ بھال کے لیے ایک مددگار کی ضرورت تو تھی ہی اور قرینہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت وہ کسی موزوں آدمی کی تلاش میں بھی تھے۔ اس وجہ سے صاحبزادی صاحبہ نے سفارش کی کہ انھی کو ملازم رکھ لیجیے۔ بہترین ملازم وہی ہوتا ہے جو قوی اور امانت دار ہو۔ یہ قوی بھی ہیں اور ساتھ ہی امانت دار بھی۔ جہاں تک جسمانی صحت و قوت کا تعلق ہے یہ ایک ایسی کھلی ہوئی چیز ہے کہ آدمی بیک نظر اس کا اندازہ کر سکتا ہے لیکن امانت و دیانت کا تعلق کردار سے ہے جس کا صحیح صحیح اندازہ تجربہ سے ہوتا ہے۔ یہ تجربہ عام حالات میں تو بہت دیر میں ہوتا ہے لیکن بعض حالات میں بالکل باوّل وہلہ ہو جاتا ہے۔ آدمی کی پیشانی اور اس کی نگاہیں گواہی دیتی ہیں کہ یہ کس کردار کا آدمی ہے۔ صاحبزادی صاحبہ نے حضرت موسیٰؑ کی مروت، بے نیازی اور پاکیزہ نگاہی کا تجربہ تو خود ہی کر لیا تھا پھر ان کی نبوت کی وہ سرگزشت، جو

حضرت موسیٰ نے حضرت شعیبؑ کو سنائی، سن کر ان پر یہ حقیقت بالکل واضح ہوگئی کہ اس عزم و ہمت کے آدمی کے اندر اگر امانت و دیانت نہ ہوگی تو بھلا کس میں ہوگی!

قَالَ اِنِّیْۤ اُرِیْدُ اَنْ اُنْكِحَكَ اِحْدَى ابْنَتَیَّ هٰتَیْنِ عَلٰۤى اَنْ تَاْجُرَنِیْ ثَمٰنِیَ حِجَجٍ ۚ فَاِنْ اَتْمَمْتَ عَشْرًا فَمِنْ عِنْدِكَ ۚ وَ مَاۤ اُرِیْدُ اَنْ اَشُقَّ عَلَیْكَ ؕ سَتَجِدُنِیْۤ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰلِحِیْنَ (۲۷)

حضرت شعیبؑ کی پیشکش

حضرت شعیبؑ نے حضرت موسیٰ کے سامنے یہ پیش کش فرمائی کہ میں چاہتا ہوں کہ اپنی ان دونوں بیٹیوں میں سے ایک کا نکاح اس شرط پر تمھارے ساتھ کردوں کہ تم آٹھ سال میری خدمت کرو اور اگر تم نے دس سال پورے کردیے تو یہ تمھاری مرضی پر منحصر ہے۔ میں اس معاملے میں تم پر کوئی بوجھ نہیں ڈالنا چاہتا، ویسے ان شاءاللہ تم مجھے بھلے آدمیوں میں سے پاؤ گے۔ قرینہ دلیل ہے کہ حضرت شعیبؑ نے یہ پیش کش اشارۂ غیبی پر فرمائی ہوگی اور ان کا یہ ارشاد کہ "وَمَاۤ اُرِیْدُ اَنْ اَشُقَّ عَلَیْكَ" حضرت موسیٰ کو معاملہ پر غور کر کے فیصلہ کرنے کے لیے ایک مہلت تھی کہ وہ اس شرط پر اچھی طرح غور کر کے فیصلہ کریں، ان کے دباؤ میں آکر مجبورانہ کوئی فیصلہ نہ کریں۔

یہاں مہر کے معاملے پر کسی بحث کی ضرورت نہیں ہے۔ مہر کا تعلق کلیۃً لڑکی کی مرضی سے ہے۔ اگر باپ اس نکاح کسی ایسی شرط پر کردے جو جائز ہو اور لڑکی اس پر راضی ہو تو اس میں کوئی شرعی قباحت نہیں ہے۔

قَالَ ذٰلِكَ بَیْنِیْ وَ بَیْنَكَ ؕ اَیَّمَا الْاَجَلَیْنِ قَضَیْتُ فَلَا عُدْوَانَ عَلَیَّ ؕ وَ اللّٰهُ عَلٰى مَا نَقُوْلُ وَكِیْلٌ (۲۸)

حضرت موسیٰ کی طرف سے پیش کش کی منظوری

حضرت موسیٰ نے یہ پیشکش اور یہ شرط دونوں منظور کرلیں۔ فرمایا کہ ان دونوں مدتوں میں سے جو مدت بھی میں پوری کرسکا مجھے اس کا اختیار حاصل رہے گا۔ 'نَقُوْلُ' یہاں قول و قرار اور عہد و پیمان کے مفہوم میں ہے یعنی اس وقت ہم جو قول و قرار کر رہے ہیں اس پر ہم اللہ کو گواہ ٹھہراتے ہیں۔

فَلَمَّا قَضٰى مُوْسَى الْاَجَلَ وَ سَارَ بِاَهْلِهٖۤ اٰنَسَ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ نَارًا ۚ قَالَ لِاَهْلِهِ امْكُثُوْۤا اِنِّیْۤ اٰنَسْتُ نَارًا لَّعَلِّیْۤ اٰتِیْكُمْ مِّنْهَا بِخَبَرٍ اَوْ جَذْوَةٍ مِّنَ النَّارِ لَعَلَّكُمْ تَصْطَلُوْنَ (۲۹)

مصر کو واپسی اور جلوۂ طور کا مشاہدہ

حضرت موسیٰ موعودہ مدت پوری کرنے کے بعد اپنے بیوی بچوں کے ساتھ مصر کے لیے روانہ ہوئے۔ اس بات کی تصریح قرآن یا تورات میں نہیں ہے کہ انھوں نے آٹھ سال کی مدت پوری کی یا وہاں دس سال گزارے۔ البتہ تورات سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ساتھ بیوی کے سوا آپ کے دو بچے بھی تھے۔ جب جبل طور کے قریب پہنچے تو رات اندھیری تھی اور سردی بھی تھی۔ اندھیرے میں راستہ کا پتہ نہیں چل رہا تھا۔ اتنے میں طور کی جانب سے آگ کی ایک چمک سی دکھائی دی۔ آپ نے بیوی بچوں سے فرمایا، تم لوگ یہیں

ٹھہرو۔ مجھے آگ کی چمک نظر آئی ہے۔ میں وہاں جاتا ہوں۔ اگر وہاں کچھ لوگ ہوئے تو راستہ کی خبر لاتا ہوں ورنہ آگ ہی کا ایک انگارہ لاؤں تاکہ تم لوگ تاپ سکو۔

فَلَمَّآ اَتٰىهَا نُوْدِیَ مِنْ شَاطِئِ الْوَادِ الْاَیْمَنِ فِی الْبُقْعَةِ الْمُبٰرَكَةِ مِنَ الشَّجَرَةِ اَنْ یّٰمُوْسٰۤی اِنِّیْۤ اَنَا اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ (۳۰)

اس آیت کے تمام اجزاء کی وضاحت سورۂ طٰہٰ اور سورۂ نمل وغیرہ کی تفسیر میں پیچھے گزر چکی ہے۔

جب حضرت موسیٰؑ اس جگہ پہنچے جہاں سے ان کو آگ نظر آئی تھی تو وادیٔ مبارک کے کنارے سے، جو مبارک خطہ میں تھی، ایک خاص درخت سے یہ آواز آئی اے موسیٰ! یہ تو میں ہوں، اللہ، عالم کا خداوند!

یہاں آواز کی نشان دہی کے لیے تین ظرف مذکور ہوئے ہیں، ایک یہ کہ یہ آواز وادیٔ مبارک کی سمت سے آئی، دوسرا یہ کہ یہ وادی، مبارک خطہ میں تھی، تیسرا یہ کہ یہ آواز ایک خاص درخت سے آئی۔ ان تمام تعینات کے ذکر سے مقصود یہ واضح کرنا ہے کہ حضرت موسیٰؑ کو یہ آواز فضائے لامتناہی کے اندر ایک مبہم و بے جہت آواز کی صورت میں نہیں بلکہ تعین جہت و مقام کے ساتھ ایک مبارک وادی، ایک مبارک خطہ اور ایک مبارک درخت سے سنائی دی۔ کسی وادی یا خطہ یا درخت کا مبارک ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنے نور و ظہور کے لیے انتخاب فرمایا اور اس کا لازمی تقاضا یہ بھی ہے کہ وہ اس کے قدوسیوں کی جلوہ گاہ اور ہر قسم کی شیطانی دراندازی سے پاک و محفوظ ہو۔ سورۂ نمل کی آیت ۸ پر ایک نظر ڈال لیجیے۔

پہلی آواز جو حضرت موسیٰؑ کو سنائی دی

'اِنِّیْۤ اَنَا اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ' اوپر کے ٹکڑے میں آواز کے محل و مقام کی پاکی و برتری کا اظہار تھا۔ یہ وہ آواز ہے جو سب سے پہلے حضرت موسیٰؑ کو سنائی دی۔ ارشاد ہوا کہ تم تو آگ سمجھ کر یہاں آگ لینے آئے ہو لیکن یہاں آگ نہیں بلکہ میں ہوں، اللہ، عالم کا خداوند! یہ اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات والا صفات کا تعارف کرایا ہے۔ 'رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ' کے مضمرات بہت وسیع ہیں اس وجہ سے بعض مقامات میں یہی مضمون دوسرے الفاظ میں بھی وارد ہوا ہے۔ مثلاً سورۂ نمل میں ہے اِنَّهٗۤ اَنَا اللّٰهُ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ۔ یہ اسی 'رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ' ہی کے مضمون کی وضاحت دوسرے الفاظ میں ہے۔

وَاَنْ اَلْقِ عَصَاكَ ؕ فَلَمَّا رَاٰهَا تَهْتَزُّ كَاَنَّهَا جَآنٌّ وَّلّٰی مُدْبِرًا وَّلَمْ یُعَقِّبْ ؕ یٰمُوْسٰۤی اَقْبِلْ وَلَا تَخَفْ ۫ اِنَّكَ مِنَ الْاٰمِنِیْنَ (۳۱)

پہلا معجزہ

ساتھ ہی یہ ہدایت ہوئی کہ اپنا عصا زمین پر ڈال دو۔ حضرت موسیٰؑ نے اس ہدایت کی تعمیل کی تو دیکھا کہ عصا سانپ کی طرح حرکت کرنے لگا ہے۔ یہ منظر دیکھ کر وہ سخت دہشت زدہ ہوئے اور اس طرح پیچھے کو بھاگے کہ اس کی طرف مڑ کے دیکھنے کی بھی جرأت نہیں کی۔ 'وَلَمْ یُعَقِّبْ' کی وضاحت سورۂ نمل کی آیت ۱۰ کے تحت ہو چکی ہے۔

حضرات انبیائے کرام علیہم السلام کو نبوت کے ابتدائی شاہدات بالکل بے سان گمان پیش آتے ہیں، نہ ان کے ذہن میں پہلے سے ان کا کوئی تصور ہوتا، نہ ارمان، اس وجہ سے شروع شروع میں وہ ان سے گھبراتے ہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ ان کو بالتدریج ان سے مانوس کر دیتا ہے۔ ساحروں، کاہنوں، متنبیوں اور مفتریوں کے ذہن میں تو پہلے سے ایک اسکیم ہوتی ہے اور وہ اس کے لیے بہت سے پاپڑ بیلتے ہیں اور جب ان کو عوام فریبی کے لیے کوئی اشغلہ ہاتھ آجاتا ہے تو اس کو اپنی بہت بڑی کامیابی سمجھتے ہیں لیکن حضرات انبیائے کرام اس قسم کے وساوس سے بالکل پاک ہوتے ہیں اس وجہ سے ان کو کوئی معجزہ دیا جاتا ہے تو وہ ان کے لیے ایک بالکل انوکھی چیز ہوتا ہے۔ حضرت موسیٰ جس قوم کی طرف رسول بنا کر بھیجے جانے والے تھے اس کے ساحروں کا سب سے بڑا کمال یہ تھا کہ وہ اپنی لاٹھیوں اور رسیوں کو سانپ بنا دیتے اور اس فن کو حاصل کرنے کے لیے نہیں معلوم وہ کیا کیا ریاضتیں کرتے اور جب اس میں کامیاب ہو جاتے تو سمجھتے کہ ان کی زندگی کی سب سے بڑی مراد حاصل ہو گئی لیکن حضرت موسیٰ کا حال یہ ہوا کہ جب اللہ تعالیٰ نے ان کی لاٹھی کو سانپ بنا دیا تو وہ اس سے خوف زدہ ہو کر بھاگے۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کے اس ابتدائی مشاہدہ کے اس پہلو کو خاص طور پر اسی لیے نمایاں فرمایا ہے کہ آپ کے جس معجزے کو فرعونیوں نے سحر و ساحری کا کرشمہ قرار دیا اس کو دیے جانے کے وقت حضرت موسیٰ پر کیا گزری!

یٰمُوْسٰٓی اَقْبِلْ وَلَا تَخَفْ اِنَّکَ مِنَ الْاٰمِنِیْنَ۔ حضرت موسیٰ پر یہ اضطراری دہشت جب طاری ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے نہایت رأفت کے ساتھ ان کو اطمینان دلایا کہ اے موسیٰ! آگے بڑھو، اس کو اٹھاؤ، اس سے تمہارے لیے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ یہ خطرہ ہے تو تمہارے دشمنوں کے لیے ہے تم ہر قسم کے خطرے سے محفوظ ہو۔ سورۂ نمل میں یہی مضمون لَا یَخَافُ لَدَیَّ الْمُرْسَلُوْنَ کے الفاظ سے بیان ہوا ہے۔ یعنی تم تو ہمارے ایک رسول ہو۔ ہم اپنے رسولوں کو اپنے خاص اسلحہ سے مسلح کرتے ہیں۔ ان سے جو خطرہ پیش آتا ہے وہ ہمارے دشمنوں کو پیش آتا ہے نہ کہ ہمارے رسولوں کو۔

اُسْلُکْ یَدَکَ فِیْ جَیْبِکَ تَخْرُجْ بَیْضَآءَ مِنْ غَیْرِ سُوْٓءٍ ز وَّاضْمُمْ اِلَیْکَ جَنَاحَکَ مِنَ الرَّھْبِ فَذٰنِکَ بُرْھَانٰنِ مِنْ رَّبِّکَ اِلٰی فِرْعَوْنَ وَمَلَاۡئِہٖ ط اِنَّھُمْ کَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِیْنَ (۳۲)

یہ دوسرے معجزے کے ظہور کا طریقہ بتایا گیا کہ تم اپنا ہاتھ گریبان میں ڈالو، پھر جب اس کو نکالو گے تو وہ بغیر کسی مرض کے چٹا سفید نکلے گا۔ وَاضْمُمْ اِلَیْکَ جَنَاحَکَ مِنَ الرَّھْبِ یہ ہاتھ کو گریبان میں ڈالنے کا طریقہ بتایا گیا کہ جس طرح کوئی شخص ڈر سے اپنے بازو بھینچ لیتا ہے اس طرح تم اپنا ہاتھ بازو کے اندر ڈال کر اس کو بھینچ لو۔ یہی مضمون سورۂ طٰہٰ میں یوں بیان ہوا ہے۔

وَاضْمُمْ یَدَکَ اِلٰی جَنَاحِکَ تَخْرُجْ بَیْضَآءَ مِنْ غَیْرِ سُوْٓءٍ (۲۲)	اور اپنا ہاتھ اپنے گریبان کی طرف سکیڑ لو وہ وہاں سے بغیر کسی مرض کے سفید بر آمد ہو گا۔

حضرات انبیاءؑ پر ابتدائی مشاہدات کا اثر

دوسرا معجزہ اور اس کے ظہور کا طریقہ

مِنَ الرَّهْبِ' یہاں اسی طرح آیا ہے جس طرح دوسرے مقامات میں 'مِنَ الذُّلِّ' یا 'مِنَ الرَّحْمَةِ' وغیرہ الفاظ آئے ہیں۔

فَذٰنِكَ بُرْهَانٰنِ مِنْ رَّبِّكَ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ۔

'اِلٰی' سے پہلے یہاں کوئی فعل محذوف ہے جس کی مثالیں پیچھے بھی گزر چکی ہیں، آگے بھی آ رہی ہیں۔ یعنی اپنے رب کی طرف سے ان دو واضح نشانیوں کے ساتھ فرعون اور اس کی قوم کے پاس انذار کے لیے جاؤ۔ 'اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ' میں اس بات کی توجیہ ہے کہ تمھیں ان عظیم نشانیوں سے کیوں مسلح کیا گیا ہے اور فرعون اور اس کی قوم کے پاس تمھیں کیوں بھیجا جا رہا ہے۔ فرمایا کہ اس لیے کہ وہ بڑے ہی نافرمان اور سرکش ہو گئے ہیں۔ ان کو اس سرکشی کے انجام سے آگاہ اور ان واضح نشانیوں کے ذریعے سے ان پر حجت تمام کر دو۔

قَالَ رَبِّ اِنِّيْ قَتَلْتُ مِنْهُمْ نَفْسًا فَاَخَافُ اَنْ يَّقْتُلُوْنِ (۳۳)

حضرت موسیٰ کا ایک اندیشہ

حضرت موسیٰ اس عظیم مہم کے لیے حکم الٰہی کی تعمیل میں تیار تو ہو گئے لیکن ساتھ ہی اپنے ایک اندیشہ کا بھی انھوں نے اظہار فرمایا کہ میں نے ان کے ایک آدمی کو قتل کیا ہے اس وجہ سے ڈرتا ہوں کہ وہ مجھے دیکھتے ہی قتل کر دیں گے۔ حضرت موسیٰ کا مطلب یہ تھا کہ یوں تو میں آٹھ دس سال باہر گزارنے کے بعد مصر جا رہا ہوں اس وجہ سے گمان ہے کہ شاید وہ اس واقعہ کو بھول چکے ہوں لیکن ایک رسول کی حیثیت سے اگر میں ان کے پاس گیا تو بھلا وہ کب مجھے معاف کرنے والے ہیں۔

وَاَخِيْ هٰرُوْنُ هُوَ اَفْصَحُ مِنِّيْ لِسَانًا فَاَرْسِلْهُ مَعِيَ رِدْاً يُّصَدِّقُنِيْٓ ۡ اِنِّيْٓ اَخَافُ اَنْ يُّكَذِّبُوْنِ (۳۴)

'رِدْءًا' کے معنی مددگار و معین کے ہیں۔ دوسرے مقامات میں اسی مفہوم کے لیے 'وزیر' استعمال ہوا ہے۔

'يُصَدِّقُنِيْ' یعنی 'يُؤَيِّدُنِيْ' وہ میری مدد کریں۔

حضرت ہارونؑ کے تعاون کی درخواست

یہ حضرت موسیٰ نے اپنی ایک اور مشکل کا اظہار فرمایا۔ سورہ طٰہٰ کی تفسیر میں یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ وہ اپنی اس عظیم ذمہ داری کے اعتبار سے اپنی قوت بیان میں کمی محسوس فرماتے تھے اس وجہ سے انھوں نے اللہ تعالیٰ سے یہ درخواست بھی کی کہ میرے بھائی ہارونؑ مجھ سے زیادہ فصیح اللسان ہیں، انھیں اس کام میں میرا مددگار بنا دے کہ وہ میری تائید و مدد کریں۔ یہی بات دوسرے مقام میں یوں مذکور ہوئی ہے 'كَيْ نُسَبِّحَكَ كَثِيْرًا وَّنَذْكُرَكَ كَثِيْرًا' (طٰہٰ ۲۰: ۳۳-۳۴) (تاکہ ہم دونوں مل کر تیری زیادہ سے زیادہ تسبیح کریں اور تیرا زیادہ سے زیادہ چرچا پھیلائیں) ——— 'اِنِّيْٓ اَخَافُ اَنْ يُّكَذِّبُوْنِ' یعنی مجھے یہ ڈر ہے کہ وہ میری بات آسانی سے نہیں مانیں گے بلکہ مجھے جھٹلانے کی کوشش کریں گے اس وجہ سے میری مدد ایک فصیح اللسان

آدمی کے ذریعے سے فرما کہ ہم دونوں مل کر پوری قوت سے ان پر اتمام حجت کریں۔

قَالَ سَنَشُدُّ عَضُدَكَ بِأَخِيكَ وَنَجْعَلُ لَكُمَا سُلْطَانًا فَلَا يَصِلُونَ إِلَيْكُمَا ۚ بِآيَاتِنَا ۚ أَنتُمَا وَمَنِ اتَّبَعَكُمَا الْغَالِبُونَ (۳۵)

'سُلْطَانٌ' سے مراد یہاں غلبہ، دبدبہ اور ہیبت ہے۔

'بِاٰيٰتِنَا' میں دو امکان ہیں۔ ایک یہ کہ اس کو نَجْعَلُ لَكُمَا سُلْطَانًا سے متعلق مانیے یعنی ہم اپنے معجزات کے ذریعے سے فرعونیوں پر تمھارا دبدبہ قائم کر دیں گے۔ دوسرا یہ کہ اس سے پہلے کوئی محذوف مانیے جس کی مثال اوپر آیت ۳۲ میں گزر چکی ہے۔

فرعونیوں پر حضرت موسیٰؑ کا رعب

اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کی درخواست حضرت ہارونؑ کے بارے میں منظور فرمالی اور ساتھ ہی ان کو یہ اطمینان بھی دلادیا کہ تم خاطر جمع رکھو، ہم فرعونیوں پر تمھارا ایسا رعب و دبدبہ قائم کردیں گے کہ وہ تم پر دست درازی کی جرأت نہ کرسکیں گے۔ چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ فرعون اور اس کے اعیان پہلے ہی مقابلے میں حضرت موسیٰؑ سے اتنے مرعوب ہو گئے کہ ان سے پیچھا چھڑانے کی دلی تمنا رکھنے اور اپنی تمام سطوت و طاقت کے باوجود ان پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت نہ کرسکے۔ اس کا بڑا سبب جو تورات کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے یہ ہے کہ فرعون اور اس کے اعیان حضرت موسیٰؑ کو جھوٹا آدمی نہیں سمجھتے تھے بلکہ ان کو یقین تھا کہ یہ سچے آدمی ہیں۔ لیکن ان کی دعوت چونکہ ان کو اپنے مفاد کے خلاف نظر آتی تھی اس وجہ سے اس کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ تاہم وہ جانتے تھے کہ اگر ہم نے ان کو کوئی گزند پہنچایا تو ہماری خیر نہیں ہے۔ اس وجہ سے تمام عناد و مخاصمت کے باوجود انھوں نے ان کے قتل کی جرأت نہیں کی۔ تورات سے یہاں تک معلوم ہوتا ہے کہ جب مصر پر کوئی آفت آتی تو وہ حضرت موسیٰؑ ہی سے درخواست کرتے کہ وہ اپنے رب سے دعا کریں کہ یہ آفت ٹل جائے۔

فَلَمَّا جَاءَهُم مُّوسَىٰ بِآيَاتِنَا بَيِّنَاتٍ قَالُوا مَا هَٰذَا إِلَّا سِحْرٌ مُّفْتَرًى وَمَا سَمِعْنَا بِهَٰذَا فِي آبَائِنَا الْأَوَّلِينَ (۳۶)

حضرت موسیٰؑ کے معجزات اور ان کی دعوت کی مخالفت

جب حضرت موسیٰؑ ان روشن اور ناقابلِ تردید نشانیوں کے ساتھ فرعون اور اس کی قوم کے پاس آئے تو انھوں نے ان کے معجزات کو تو جادو کا کرشمہ قرار دیا اور ان کی دعوتِ توحید کے خلاف یہ پروپیگنڈا شروع کیا کہ یہ ہمارے آباؤ اجداد کی روایات کے بالکل خلاف ہے۔ 'سِحْرٌ مُّفْتَرًى' یعنی حضرت موسیٰؑ یہ کرشمے دکھاتے تو ہیں اپنے جادو کے زور سے لیکن ہم پر رعب جمانے کے لیے جھوٹ دعویٰ یہ کرتے ہیں کہ یہ معجزے ہیں جو ان کو خدا کی طرف سے عطا ہوئے ہیں۔ 'مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِيْٓ اٰبَآئِنَا الْاَوَّلِيْنَ' کا اشارہ حضرت موسیٰؑ کی دعوتِ توحید کی طرف ہے۔ یعنی ان کا یہ دعویٰ کہ یہ رب العلمین کے رسول ہیں بالکل انوکھا اور نرالا دعویٰ ہے۔ ہم نے اپنے اگلوں سے کسی رب العالمین کا ذکر کبھی نہیں سنا۔ آگے آیت ۳۸ میں اس کی

وضاحت آرہی ہے۔ یہ بعینہٖ وہی بات ہے جو دوسرے مقامات میں 'مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِي الْمِلَّةِ الْاٰخِرَةِ' کے الفاظ میں گزر چکی ہے۔

وَقَالَ مُوْسٰى رَبِّيْٓ اَعْلَمُ بِمَنْ جَآءَ بِالْهُدٰى مِنْ عِنْدِهٖ وَمَنْ تَكُوْنُ لَهٗ عَاقِبَةُ الدَّارِ ۭ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ (۳۷)

مستقبل سے متعلق حضرت موسیٰ کا چیلنج

یہ مستقبل سے متعلق حضرت موسیٰ کا ان کو چیلنج ہے کہ تم لوگ مجھے مفتری قرار دے رہے ہو تو میرا رب خوب جانتا ہے کہ کون اس کے پاس سے ہدایت لے کر آیا ہے اور کون لوگ جانتے بوجھتے اس کو جھٹلا رہے ہیں؟ کس کو انجام کار کی کامیابی حاصل ہونے والی ہے اور کون مغلوب و نامراد ہونے والے ہیں؟ دوسرے الفاظ میں یوں کہیے کہ حضرت موسیٰ نے نہایت بلیغ اور شائستہ اسلوب میں یہ اعلان فرما دیا کہ میں اور میرے ساتھی ان شاء اللہ غالب و فتحمند رہیں گے اور تم لوگ ذلیل و خوار ہو کر رہو گے۔

لینی یہ حقیقت بہرحال اپنی جگہ پر اٹل ہے کہ جو لوگ خدا کی بھیجی ہوئی ہدایت کی تکذیب کریں گے وہ اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے ہیں اور یہ ظالم ہرگز فلاح نہیں پائیں گے۔ اسلوب کلام دلیل ہے کہ یہاں مقابل کا جملہ حذف ہے۔ ہم نے اس کی وضاحت کر دی ہے۔

وَقَالَ فِرْعَوْنُ يٰٓاَيُّهَا الْمَلَاُ مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرِيْ ۚ فَاَوْقِدْ لِيْ يٰهَامٰنُ عَلَى الطِّيْنِ فَاجْعَلْ لِّيْ صَرْحًا لَّعَلِّيْٓ اَطَّلِعُ اِلٰٓى اِلٰهِ مُوْسٰى ۙ وَاِنِّيْ لَاَظُنُّهٗ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ (۳۸)

'ھامان' کا ذکر پیچھے گزر چکا ہے۔ یہاں سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس کو فرعون کے وزیر اعظم یا کم از کم وزیر تعمیرات کی حیثیت حاصل تھی۔

فرعون کا استہزاء

'اَوْقِدْ عَلَى الطِّيْنِ' کا یہ مفہوم بھی ہو سکتا ہے کہ اینٹوں کا پزاوہ لگوا اور یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ مٹی کی عمارت بنوا کر اس پر آگ دہکا۔ تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ نینوا اور مصر وغیرہ میں تعمیر کا یہ طریقہ معروف رہا ہے کہ مٹی کا مکان بنا کر اس پر خوب آگ دہکاتے جس سے دیواروں پر مینا کاری کی صورت پیدا ہو جاتی اور وہ بارش و ہوا کے اثرات سے بالکل محفوظ ہو جاتیں۔

'لَعَلِّيْٓ اَطَّلِعُ اِلٰٓى اِلٰهِ مُوْسٰى' میں 'اِلٰی' کا صلہ اس بات کا قرینہ ہے کہ یہاں تضمین ہے۔ گویا پوری بات یوں ہے۔ 'لعلی اطلع علی الصرح فانظر الی الٰہ موسیٰ' ظاہر ہے کہ اس نے یہ بات محض حضرت موسیٰ کا مذاق اڑانے کے لیے کہی۔ سورۂ زخرف کی آیت ۵۳ سے بھی اس کی نوعیت محض مذاق و استہزاء ہی کی معلوم ہوتی ہے۔

فرعون نے پہلے تو اپنے درباریوں کو مخاطب کر کے کہا کہ موسیٰ (علیہ السلام) جس رب العالمین کے رسول بن کر وارد ہوتے ہیں مجھے تو اس رب العلمین کا کوئی علم نہیں ہے۔ تمہارا معبود اپنے سوا میں کسی کو نہیں سمجھتا۔ مطلب یہ ہے کہ اس فتنہ سے تم لوگ ہوشیار رہو۔ اس کے بعد ہامان سے مخاطب ہو کر اس نے کہا کہ اے ہامان!

تم پکوا کر اینٹوں کا پزاوہ لگوا کر ایک اونچی عمارت بنواؤ تاکہ میں اس پر چڑھ کر موسیٰ کے رب کو جھانک کر دیکھوں کہ وہ کہاں بیٹھا ہوا ہے! میں تو اس شخص کو بالکل جھوٹا سمجھتا ہوں۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ فراعنہ و متمردین بسا اوقات نہایت واضح حقائق کا اسی طرح مذاق اڑاتے ہیں اور ان کے اندھے پیروکاروں کے لیے یہی مذاق دلیل بن جاتا ہے بلکہ کتنے احمق تو اس کے مذاق کو حقیقت سمجھ بیٹھتے ہیں۔ فرعون کے پرستاروں کے لیے کچھ بعید بھی نہیں کہ وہ اس کو حقیقت سمجھے ہوں۔ اس لیے کہ اس کی حیثیت مصریوں کے نزدیک ان کے سب سے بڑے دیوتا — سورج — کے اوتار کی تھی۔ ایک اوتار کے لیے آسمانوں کے اطراف و جوانب میں جھانک لینا کیا مشکل ہے! سورۂ مومن میں اس کا یہ قول یوں نقل ہوا ہے۔ یٰھَامٰنُ ابْنِ لِیْ صَرْحًا لَّعَلِّیْٓ اَبْلُغُ الْاَسْبَابَ ۝ اَسْبَابَ السَّمٰوٰتِ (المومن ۴۰: ۳۶-۳۷) (اے ہامان، میرے لیے ایک اونچی عمارت بنوا تاکہ میں آسمانوں کے اطراف میں پہنچوں) اس پہلو سے اس کی یہ بات اپنے عوام کو بے وقوف بنانے کی ایک چال بھی ہو سکتی ہے۔

وَاسْتَكْبَرَ هُوَ وَجُنُوْدُهٗ فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ الْحَقِّ وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ اِلَیْنَا لَا یُرْجَعُوْنَ (۳۹)

استکبار بغیر الحق

'بَغْیٌ بِغَیْرِ الْحَقِّ' کی وضاحت اس کے محل میں ہو چکی ہے۔ وہی مفہوم 'اِسْتِکْبَارٌ بِغَیْرِ الْحَقِّ' کا بھی ہے۔ اس زمین و آسمان میں استکبار کا حق صرف اس کو حاصل ہے جس نے ان کو پیدا کیا اور ان کے نظام کو چلا رہا ہے۔ جن کو نہ ان کے خلق میں کوئی دخل اور نہ جن کا ان کے تدبیر و انتظام میں کوئی حصہ اگر وہ اس میں اکڑیں اور اپنی مالکیت کے مدعی بن کر اٹھیں تو یہ ان کی شامت کی دلیل ہے۔ اس قسم کے استکبار کو اس کائنات کا خالق زیادہ مہلت نہیں دیتا۔ یہ امر بھی یہاں ملحوظ رہے کہ اس زمین کے بادشاہ حقیقی کے حکم و قانون کے خلاف کوئی قانون اس میں جاری کرنا بھی 'استکبار بغیر الحق' میں داخل ہے اور یہ ٹھیک ٹھیک اسوۂ فرعون کی پیروی ہے۔

'وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ اِلَیْنَا لَا یُرْجَعُوْنَ'۔ یہ اس استکبار کی علت بیان ہوئی ہے کہ وہ اس وجہ سے اس میں مبتلا ہوئے کہ انھوں نے یہ گمان کیا کہ خدا نے ان کو شتر بے مہار بنا کر چھوڑ رکھا ہے اور ان کو اس کے سامنے کبھی جواب دہی کے لیے حاضر ہونا نہیں ہے۔

فَاَخَذْنٰهُ وَجُنُوْدَهٗ فَنَبَذْنٰهُمْ فِی الْیَمِّ ۚ فَانْظُرْ كَیْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظّٰلِمِیْنَ (۴۰)

استکبار کا انجام

یہ اس استکبار کا انجام بیان فرمایا کہ ہم نے فرعون اور اس کی فوجوں کو پکڑا اور ان کو اٹھا کر سمندر میں پھینک دیا۔ ان کے پکڑنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے جو تدبیر اختیار فرمائی اس کی پوری تفصیل پچھلی سورتوں، بالخصوص سورۂ طٰہٰ کی تفسیر میں، گزر چکی ہے۔ 'فَانْظُرْ كَیْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظّٰلِمِیْنَ' یہ اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی گئی ہے جس کو واضح کرنے ہی کے لیے یہ سرگزشت سنائی گئی ہے۔ اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی بھی ہے اور ان فرعونوں کے لیے تنبیہ و تذکیر بھی جو آنحضرتؐ

اور آپ کی دعوت کے معاملے میں بالکل اسی روش پر چل رہے تھے جو روش حضرت موسیٰؑ کے مقابل میں فرعون اور اس کے اعوان و انصار نے اختیار کی تھی۔

وَجَعَلْنٰهُمْ اَىِٕمَّةً یَّدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ ۚ وَیَوْمَ الْقِیٰمَةِ لَا یُنْصَرُوْنَ (۴۱)

'جَعَلْنَا' یہاں 'اَمْهَلْنَا' کے مفہوم پر متضمن ہے جس کی مثالیں گزر چکی ہیں اور 'یَدْعُوْنَ' سے پہلے فعل ناقص محذوف ہے۔

یہ اسی استکبار کے انجام کی مزید تفصیل ہے کہ ہم نے دنیا میں ان کو ڈھیل دی اور وہ جہنم کی طرف دعوت دینے والے لیڈر بنے رہے اور قیامت کے روز ان کا حال یہ ہوگا کہ کسی طرف سے ان کی کوئی مدد نہیں ہوگی۔ دنیا میں وہ جن کے امام و پیشوا بنے رہے وہ سب ان کا ساتھ چھوڑ دیں گے۔ ہر ایک پر نفسی نفسی کی حالت ہوگی۔ نہ لیڈر پیرؤوں کے کچھ کام آسکیں گے اور نہ پیرو لیڈروں کے۔

وَاَتْبَعْنٰهُمْ فِیْ هٰذِهِ الدُّنْیَا لَعْنَةً ۚ وَیَوْمَ الْقِیٰمَةِ هُمْ مِّنَ الْمَقْبُوْحِیْنَ (۴۲)

جس دنیا میں وہ لیڈری اور پیشوائی کرتے رہے اور لوگوں سے اپنے نعرے لگواتے رہے، فرمایا کہ اس میں ہم نے ان کے پیچھے ہمیشہ کے لیے لعنت لگا دی اور آخرت میں بھی وہ ذلیل و خوار ہوں گے۔ یہی مضمون سورۂ ہود میں یوں بیان ہوا ہے۔

فَاتَّبَعُوْٓا اَمْرَ فِرْعَوْنَ ۚ وَمَآ اَمْرُ فِرْعَوْنَ بِرَشِیْدٍ ، یَقْدُمُ قَوْمَهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ فَاَوْرَدَهُمُ النَّارَ ۭ وَبِئْسَ الْوِرْدُ الْمَوْرُوْدُ ، وَاُتْبِعُوْا فِیْ هٰذِهٖ لَعْنَةً وَّیَوْمَ الْقِیٰمَةِ ۭ بِئْسَ الرِّفْدُ الْمَرْفُوْدُ (ھود: ۹۷-۹۹)	تو انھوں نے فرعون کی رائے کی پیروی کی اور فرعون کی رائے صائب نہ تھی۔ وہ قیامت کے دن اپنی قوم کے آگے آگے ہوگا اور ان کو دوزخ کے گھاٹ پر اتارے گا اور کیا ہی برا ہوگا یہ گھاٹ! اور اس دنیا میں بھی ان کے پیچھے لعنت لگا دی گئی اور قیامت کے دن بھی، اور کیا ہی برا ہوگا یہ صلہ جو ان کو ملے گا!

وَلَقَدْ اٰتَیْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ مِنْۢ بَعْدِ مَآ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ الْاُوْلٰى بَصَآىِٕرَ لِلنَّاسِ وَهُدًى وَّرَحْمَةً لَّعَلَّهُمْ یَتَذَكَّرُوْنَ (۴۳)

مظلوموں پر انعام

ظالموں کا انجام واضح کرنے کے بعد یہ اس فضل و انعام کا ذکر ہے جو اللہ تعالیٰ نے مظلوموں پر فرمایا۔ اور جس کی طرف اس سرگزشت کی تمہید میں 'وَنُرِیْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِیْنَ اسْتُضْعِفُوْا ... الآیۃ' کے الفاظ سے اشارہ گزر چکا ہے۔ فرمایا کہ ہم نے پچھلی قوموں کو ہلاک کرنے کے بعد موسیٰؑ کو کتاب عطا کی۔ اس کتاب کی صفت یہ بیان فرمائی کہ وہ لوگوں کے لیے بصیرت، ہدایت اور رحمت تھی۔ 'بصیرت' یعنی دل و دماغ کی صلاحیتیں اور تعقل و تفکر کی قوتیں بیدار کرنے والی۔ اس کو بصورت جمع لانے سے مقصود یہ واضح کرنا ہے

کہ وہ ایسی آیات اور ایسے دلائل پر مشتمل تھی جو آنکھیں کھول دینے والی تھیں۔ ہُدًی وَرَحْمَۃً کی وضاحت ہم کر چکے ہیں کہ یہ دونوں لفظ جب ساتھ ساتھ آتے ہیں تو مطلب یہ ہوتا ہے کہ آغاز، یعنی اس دنیا کی زندگی میں، ہدایت اور انجام، یعنی آخرت کی زندگی میں رحمت۔

یہ واضح رہے کہ کسی قوم کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کتاب و شریعت کا دیا جانا دنیا کی امامت و پیشوائی دیے جانے کے ہم معنی ہے بشرطیکہ وہ اس نعمت کی قدر کرے۔ بنی اسرائیل کو یہ نعمت سب سے پہلے دی گئی۔ یہاں مِنْ بَعْدِ مَآ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ الْاُوْلٰى سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ باقاعدہ کتابی شکل میں، اللہ کی یہ سب سے بڑی نعمت سب سے پہلے حضرت موسیٰؑ کے ذریعہ سے بنی اسرائیل ہی کو ملی لیکن انھوں نے اس کتاب کے ساتھ نہایت بے دردانہ سلوک کیا جس کی تفصیل سورۂ بقرہ کی تفسیر میں گزر چکی ہے۔

وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الْغَرْبِيِّ اِذْ قَضَيْنَآ اِلٰى مُوْسَى الْاَمْرَ وَمَا كُنْتَ مِنَ الشّٰهِدِيْنَ (۴۴)

آنحضرتؐ کی رسالت کا اثبات

سرگزشت کے آخر میں یہ اور اس کے بعد کی دو آیتیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف التفات کی نوعیت کی ہیں جن میں آپؐ کی نبوت کا اثبات ہے اور کلام کا رخ یہود کی طرف بھی ہے اور قریش کی طرف بھی۔ فرمایا کہ تم موسیٰؑ کو کتاب دیے جانے کے وقت نہ تو طور کے مغربی جانب ہی میں موجود تھے جب کہ ہم نے معاملہ کا فیصلہ کر کے اس سے موسیٰؑ کو آگاہ کیا اور نہ ان لوگوں کے ساتھ ہی موجود تھے جو اس وقت پہاڑ کے نیچے موسیٰؑ کی قوم میں سے تورات کے انتظار میں تھے۔

بِجَانِبِ الْغَرْبِيِّ یعنی بجانب الطور الغربی۔

قَضَيْنَآ اِلٰى مُوْسَى الْاَمْرَ۔ قَضَيْنَا یہاں عَهِدْنَا کے مفہوم پر متضمن ہے جس طرح دوسرے مقام میں عَهِدْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ آیا ہے۔

وَمَا كُنْتَ مِنَ الشّٰهِدِيْنَ میں شَاهِدِيْنَ سے مراد حضرت موسیٰؑ کی قوم کے لوگ ہیں۔ یہ اس وقت کی بات کا حوالہ ہے جب حضرت موسیٰؑ اپنی قوم کو دامن کوہ میں چھوڑ کر، اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے مطابق تورات لینے، تنہا طور پر تشریف لے گئے ہیں۔ اس اثناء میں قوم، طور کے نیچے حضرت موسیٰؑ کا انتظار کرتی رہی اور اسی موقع پر سامری کا فتنہ پیش آیا ہے۔ تفصیل ان تمام واقعات کی پچھلی سورتوں میں گزر چکی ہے۔

مقصود کلام یہ ہے کہ تورات دیے جانے کے وقت نہ تو تم حضرت موسیٰؑ کے ساتھ ہی موجود تھے اور نہ ان کی قوم ہی کے ساتھ تو آخر یہ ساری سرگزشت اس صحت و صداقت اور اس تفصیل کے ساتھ تمھیں کس طرح معلوم ہوئی؟ یہ اس بات کی صاف دلیل ہے کہ اللہ نے ان باتوں سے تمھیں اپنی وحی کے ذریعہ سے آگاہ فرمایا اور تم اس کے رسول ہو۔

یہ امر ملحوظ رہے کہ حضرت موسیٰؑ کی سرگزشت جس تفصیل اور جس صحت و صداقت کے ساتھ قرآن میں بیان ہوئی ہے اس تفصیل و صحت کے ساتھ تورات میں نہیں بیان ہوئی ہے۔ اگر آپ سرگزشت کے اتنے ہی حصے کو، جتنی اس سورہ میں بیان ہوئی ہے، تورات کے بیان سے اس کا موازنہ کیجیے تو آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ قرآن کے بیان کے مقابل میں تورات کا بیان بے ربط اور محرف بھی ہے اور ان تمام ضروری اجزا سے خالی بھی جو اس سرگزشت کی اصل روح ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ ساری باتیں اس صحت و صداقت کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کس طرح معلوم ہوئیں؟ اگر کوئی ہٹ دھرم یہ کہے کہ آپ نے یہ باتیں اہل کتاب سے سن کر نقل کیں تو یہ بالبداہت غلط ہے۔ جو شخص سنی سنائی بات نقل کرتا ہے وہ مشہور روایت کے مطابق نقل کرتا ہے نہ کہ اس سے بالکل مختلف۔ اور وہ بھی ایسی صحت و تنقید کے ساتھ کہ جو منصف بھی اس کو سنے پکار اٹھے کہ واقعہ کی اصل نوعیت یہ ہے جو قرآن نے بیان کی ہے نہ کہ وہ جو تورات کے راویوں نے پیش کی ہے۔ اگر طوالت کا اندیشہ نہ ہوتا تو میں قرآن اور تورات دونوں کے بیانات کا مقابلہ کر کے دکھاتا کہ تورات میں سرگزشت کے اصل اجزا یا تو غائب ہیں یا بالکل مسخ شدہ صورت میں ہیں۔ برعکس اس کے قرآن نے واقعہ کے تمام فطری اجزا ایسے منطقی ربط و تسلسل کے ساتھ پیش کیے ہیں کہ ان کی توعظمت و حکمت آپ سے آپ دل میں اترتی جاتی ہے۔

وَلٰكِنَّآ اَنْشَاْنَا قُرُوْنًا فَتَطَاوَلَ عَلَيْهِمُ الْعُمُرُ ۚ وَمَا كُنْتَ ثَاوِيًا فِيْٓ اَهْلِ مَدْيَنَ تَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا ۙ وَلٰكِنَّا كُنَّا مُرْسِلِيْنَ (۴۵)

اس آیت کے ابتدائی ٹکڑے کا تعلق اوپر والی آیت سے ہے یعنی تم ان احوال سے واقف نہیں تھے لیکن ہم نے تم کو واقف کیا۔ اور یہ اس لیے کیا کہ موسیٰؑ کے بعد ہم نے بہت سی نسلیں پیدا کیں، قرنوں پر ایک طویل زمانہ گزر گیا اور لوگ ہماری اس کتاب کو بھلا بیٹھے جو ہم نے ان کو ہدایت و رحمت بنا کر عطا کی تھی۔ اس وجہ سے ضروری ہوا کہ ہم تمھارے ذریعہ سے اس ہدایت کو از سر نو زندہ کریں۔ یہاں 'فَتَطَاوَلَ عَلَيْهِمُ الْعُمُرُ' کے بعد 'فَنَسُوْا اٰيٰتِنَا' یا اس کے ہم معنی الفاظ بربنائے قرینہ محذوف ہیں۔

'وَمَا كُنْتَ ثَاوِيًا فِيْٓ اَهْلِ مَدْيَنَ' یعنی جس طرح تم موسیٰؑ کو تورات دیے جانے کے وقت طور کے جانب غربی میں موجود نہیں تھے اسی طرح مدین میں بھی موجود نہ تھے کہ حضرت موسیٰؑ کے اس دور کے حالات سے واقف ہو سکتے جو انھوں نے مدین میں گزارا یا حضرت شعیبؑ کی دعوت اور ان کی قوم کے انجام سے واقف ہوتے۔ ان چیزوں میں سے تم کسی چیز سے بھی واقف نہ تھے لیکن ہم نے تم کو ان سے واقف کیا کہ جس طرح ہم نے پہلے رسول بھیجے اسی طرح تمھیں رسول بنائیں۔ 'كُنَّا مُرْسِلِيْنَ' اسی طرح کا اسلوب جس طرح 'كُنَّا فٰعِلِيْنَ' ہے۔ یہ اسلوب کلام کسی فیصلہ قطعی اور عزم جازم کے اظہار کے لیے آتا ہے۔

'اھل مدین کے بعد 'تَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا' کے اضافہ سے یہاں اشارہ حضرت شعیبؑ کی سرگزشت کی طرف بھی ہوگیا جو قرآن کی متعدد سورتوں میں تفصیل سے بیان ہوئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہاں کے لوگوں پر انذار و تبشیر کا فرض انجام دینے پر تم تو مامور نہ تھے لیکن خدا نے تم کو وہاں کے حالات سے بھی باخبر کیا۔ یہ اس بات کی نہایت واضح دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ چاہا ہے کہ تم سے بھی وہی کام لے جو تم سے پہلے مبعوث ہونے والے رسولوں سے اس نے لیا۔ بدقسمت ہیں وہ لوگ جو اس حقیقت کو نہ سمجھیں۔

وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الطُّوْرِ اِذْ نَادَيْنَا وَلٰكِنْ رَّحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اَتٰهُمْ مِّنْ نَّذِيْرٍ مِّنْ قَبْلِكَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ (۴۶)

یعنی جس طرح تم مدین میں موجود نہ تھے اسی طرح تم طور کے پہلو میں بھی اس وقت موجود نہ تھے جب ہم نے موسیٰؑ کو آواز دی ہے۔ یہ اشارہ ہے اس آواز دینے کی طرف جس کا ذکر آیت ۳۰ میں گزرا ہے 'فَلَمَّآ اَتٰهَا نُوْدِيَ مِنْ شَاطِئِ الْوَادِ الْاَيْمَنِ۔ الاٰیۃ'۔ مطلب یہ ہے کہ تم ان ساری باتوں سے بے خبر تھے لیکن رحمتِ الٰہی مقتضی ہوئی کہ وہ تم کو رسول بنائے اس وجہ سے اس نے تم کو ان باتوں سے باخبر کیا اور یہ تمہاری رسالت کی نہایت واضح دلیلیں ہیں۔ 'رَحْمَةً' سے پہلے 'اَرْسَلْنَاكَ' یا اس کے ہم معنی کوئی فعل محذوف ہے۔

آنحضرتؐ کی بعثت کا مقصد

لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اَتٰهُمْ مِّنْ نَّذِيْرٍ مِّنْ قَبْلِكَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ۔ یہ آنحضرتؐ کے اصل مقصد بعثت کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ سارا اہتمام اس لیے فرمایا کہ تم اس قوم کو انذار کرو جس کے پاس اس سے پہلے کوئی نذیر نہیں آیا تاکہ وہ یاددہانی حاصل کریں۔ یہ اشارہ بنی اسمٰعیل کی طرف ہے۔ یہ لوگ کتاب و شریعت سے بے خبر امی تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے ان کے اندر کسی رسول کی بعثت نہیں ہوئی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس دعا کے مطابق، جس کی تفصیلات پچھلی سورتوں میں گزر چکی ہیں، ان کی ہدایت کے لیے نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم کو انہی کے اندر سے مبعوث فرمایا۔ مطلب یہ ہے کہ یہ ایک بہت بڑی رحمت ہے، جو ان پر نازل ہوئی ہے اگر یہ اس کی قدر کریں۔ اور اس کے اندر یہ اشارہ بھی ہے کہ اگر انھوں نے اس نعمت کی قدر نہ کی تو یہ ان کے لیے بہت بڑی نقمت کا باعث بھی بن سکتی ہے۔ سنتِ الٰہی یہ ہے کہ اگر کوئی قوم خدا کے بھیجے ہوئے منذر کے انذار سے یاددہانی نہیں حاصل کرتی تو وہ تباہ کر دی جاتی ہے۔

۲۔ آگے کا مضمون ——— آیات ۴۷-۶۱

اوپر کی آیات التفات سے یہ بات واضح ہو گئی کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کو فرعون اور اس کی قوم کی طرف رسول بنا کر بھیجا اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قریش کی طرف رسول بنا کر بھیجا۔

آپؐ کی بعثت بہت بڑی رحمت ہے اگر وہ اس کی قدر کریں گے اور یہ بہت بڑی نقمت بھی ہو سکتی ہے اگر انھوں نے اس کی ناقدری کی۔ آگے اسی مضمون کی مزید وضاحت فرمائی ہے کہ اس رسول کی بعثت سے مقصود اتمام حجت ہے۔ اب اگر یہ لوگ کسی عذاب کی گرفت میں آئے تو یہ نہیں کہہ سکتے کہ ان کو اللہ تعالیٰ نے پہلے سے آگاہ نہیں کیا۔ لیکن ان لوگوں کا حال یہ ہے کہ یہ یہودیوں سے سیکھ کر ہمارے پیغمبر پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ ان کو بھی اس قسم کے معجزے کیوں نہیں دیے گئے جس قسم کے معجزے حضرت موسیٰ کو دیے گئے۔ ان سے پوچھو کہ حضرت موسیٰ کی قوم نے کب ان کے معجزات کی قدر کی جو تم سے یہ توقع کی جائے کہ اگر اس قسم کے معجزے تم کو دکھائے گئے تو تم ان کی قدر کرو گے! اسی ضمن میں ان اہل کتاب کی تحسین کی گئی ہے جو اپنے صحیفوں کی پیشین گوئیوں کی بنا پر قرآن کی تائید اور بڑے صبر کے ساتھ اپنی قوم کے غوغا کا مقابلہ کر رہے تھے۔ نیز قریش کے اس خدشہ کا جواب دیا گیا ہے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ اگر انھوں نے قرآن کی دعوت قبول کر لی تو اس ملک سے ان کی جڑ اکھڑ جائے گی۔ ان کو تنبیہ فرمائی گئی ہے کہ اس دعوت کے قبول کرنے کی صورت میں تو ان کے لیے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ البتہ اگر انھوں نے اس کو رد کر دیا تو سنتِ الٰہی کے بموجب ان کی تباہی یقینی ہے۔ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۴۷-۶۱

وَلَوْلَآ اَنْ تُصِيْبَهُمْ مُّصِيْبَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ فَيَقُوْلُوْا رَبَّنَا لَوْلَآ اَرْسَلْتَ اِلَيْنَا رَسُوْلًا فَنَتَّبِعَ اٰيٰتِكَ وَنَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۴۷﴾ فَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوْا لَوْلَآ اُوْتِيَ مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى ؕ اَوَلَمْ يَكْفُرُوْا بِمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى مِنْ قَبْلُ ۚ قَالُوْا سِحْرٰنِ تَظٰهَرَا ۟ وَقَالُوْۤا اِنَّا بِكُلٍّ كٰفِرُوْنَ ﴿۴۸﴾ قُلْ فَاْتُوْا بِكِتٰبٍ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ هُوَ اَهْدٰى مِنْهُمَاۤ اَتَّبِعْهُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۴۹﴾ فَاِنْ لَّمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَكَ فَاعْلَمْ اَنَّمَا يَتَّبِعُوْنَ اَهْوَآءَهُمْ ؕ وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰىهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۵۰﴾ ع وَلَقَدْ وَصَّلْنَا لَهُمُ الْقَوْلَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۵۱﴾ اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ مِنْ

قَبْلِهٖ هُمْ بِهٖ يُؤْمِنُوْنَ ﴿۵۲﴾ وَاِذَا يُتْلٰى عَلَيْهِمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِهٖٓ اِنَّهُ
الْحَقُّ مِنْ رَّبِّنَآ اِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلِهٖ مُسْلِمِيْنَ ﴿۵۳﴾ اُولٰٓئِكَ يُؤْتَوْنَ
اَجْرَهُمْ مَّرَّتَيْنِ بِمَا صَبَرُوْا وَيَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ
وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ﴿۵۴﴾ وَاِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ اَعْرَضُوْا عَنْهُ
وَقَالُوْا لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ لَا نَبْتَغِي
الْجٰهِلِيْنَ ﴿۵۵﴾ اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ
مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ ﴿۵۶﴾ وَقَالُوْٓا اِنْ نَّتَّبِعِ الْهُدٰى
مَعَكَ نُتَخَطَّفْ مِنْ اَرْضِنَا ۭ اَوَلَمْ نُمَكِّنْ لَّهُمْ حَرَمًا اٰمِنًا
يُّجْبٰٓى اِلَيْهِ ثَمَرٰتُ كُلِّ شَيْءٍ رِّزْقًا مِّنْ لَّدُنَّا وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ
لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۵۷﴾ وَكَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍۢ بَطِرَتْ مَعِيْشَتَهَا ۚ فَتِلْكَ
مَسٰكِنُهُمْ لَمْ تُسْكَنْ مِّنْۢ بَعْدِهِمْ اِلَّا قَلِيْلًا ۭ وَكُنَّا نَحْنُ
الْوٰرِثِيْنَ ﴿۵۸﴾ وَمَا كَانَ رَبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى حَتّٰى يَبْعَثَ فِيْٓ
اُمِّهَا رَسُوْلًا يَّتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا ۚ وَمَا كُنَّا مُهْلِكِي الْقُرٰٓى
اِلَّا وَاَهْلُهَا ظٰلِمُوْنَ ﴿۵۹﴾ وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيٰوةِ
الدُّنْيَا وَزِيْنَتُهَا ۚ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۶۰﴾
اَفَمَنْ وَّعَدْنٰهُ وَعْدًا حَسَنًا فَهُوَ لَاقِيْهِ كَمَنْ مَّتَّعْنٰهُ مَتَاعَ
الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ثُمَّ هُوَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ مِنَ الْمُحْضَرِيْنَ ﴿۶۱﴾

ع ۶ ۱۰ ۹

(اور ہم رسول نہ بھیجتے) اگر یہ بات نہ ہوتی کہ ان پر ان کے اعمال کے سبب سے کوئی

ترجمہ آیات ۴۷-۶۱

آفت آئی تو وہ کہیں گے کہ اے ہمارے رب، تو نے ہماری طرف کوئی رسول کیوں نہ بھیجا کہ ہم تیری آیات کی پیروی کرتے اور اہلِ ایمان میں سے بنتے۔ تو جب ان کے پاس ہماری طرف سے حق آیا تو کہتے ہیں کہ جس طرح کی چیز موسیٰ کو ملی تھی اس طرح کی چیز ان کو کیوں نہ ملی! کیا اس طرح کے لوگوں نے اس چیز کا انکار نہیں کیا جو اس سے پہلے موسیٰ کو دی گئی؟ انھوں نے کہا، دونوں ماہر جادوگر ہیں جنھوں نے گٹھ جوڑ کر رکھا ہے اور کہا کہ ہم ان سب کے منکر ہیں۔ ۴۷ - ۴۸

ان سے کہو کہ اگر تم اس کو جھٹلاتے ہو تو اللہ کے پاس سے کوئی اور کتاب لاؤ جو ان دونوں سے زیادہ ہدایت بخشنے والی ہو، میں اسی کی پیروی کروں گا، اگر تم سچے ہو۔ اگر وہ تمھارا یہ چیلنج قبول نہ کریں تو یقین کرو کہ بس یہ اپنی خواہشوں کے پیرو ہیں۔ اور ان سے بڑھ کر گمراہ کون ہو سکتا ہے جو اللہ کی ہدایت کے بغیر اپنی خواہش کے پیرو بنے ہوئے ہیں۔ اللہ ظالموں کو ہرگز راہ یاب نہیں کرے گا۔ ۴۹ - ۵۰

اور ہم نے ان کے لیے کلام کے تسلسل کو قائم رکھا تاکہ وہ یاد دہانی حاصل کریں۔ اور جن کو ہم نے کتاب عطا کی اس سے پہلے، وہ اس پر ایمان لاتے ہیں۔ اور جب وہ ان کو سنائی جاتی ہے تو کہتے ہیں ہم اس پر ایمان لائے، بے شک یہ ہمارے رب کی طرف سے حق ہے، ہم اس کے آنے سے پہلے سے اس کو ماننے والے رہے ہیں۔ یہ لوگ ہیں کہ ان کو دہرا اجر ملے گا بوجہ اس کے کہ وہ ثابت قدم رہے اور وہ برائی کو بھلائی سے دفع کرتے اور ہم نے جو رزق ان کو دے رکھا ہے، اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ اور جب یہ لغو بات سنتے ہیں تو اس سے اعراض کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمارے لیے ہمارے اعمال ہیں

اور تمھارے لیے تمھارے اعمال، پس ہمارا سلام لو، ہم جاہلوں سے الجھنا پسند نہیں کرتے۔ ۵۵-۱

تم جن کو چاہو، ہدایت نہیں دے سکتے، بلکہ اللہ ہی جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔ اور وہی ہدایت پانے والوں کو خوب جانتا ہے۔ ۵۶

اور وہ کہتے ہیں کہ اگر ہم تمھارے ساتھ ہو کر اس ہدایت کے پیرو بن جائیں تو ہم اپنے ملک سے اُچک لیے جائیں گے۔ کیا ہم نے ان کو متمکن نہیں کیا ایک مامون حرم میں جس کی طرف خاص ہمارے فضل سے ہر چیز کی پیداواریں کھنچی چلی آ رہی ہیں؛ لیکن ان کے اکثر اس بات کو نہیں جانتے۔ ۵۷

اور کتنی قومیں اپنے سامانِ معیشت کی ناشکری کرنے والی ہوئی ہیں جن کو ہم نے ہلاک کر چھوڑا۔ پس یہ ہیں ان کی بستیاں جو ان کے بعد آباد نہیں ہوئیں مگر بہت کم، اور ہم ہی ان کے وارث ہوئے۔ اور تیرا رب بستیوں کا ہلاک کرنے والا نہیں بنتا جب تک ان کی مرکزی بستی میں کوئی رسول نہ بھیج لے جو ان کو ہماری آیتیں پڑھ کر سنا دے۔ اور ہم بستیوں کو ہلاک کرنے والے نہیں بنتے مگر اسی وقت جب ان کے باشندے اپنے اوپر ظلم ڈھانے والے بن جاتے ہیں۔ ۵۸-۵۹

اور جو چیز بھی تمھیں عطا ہوئی ہے تو یہ بس حیاتِ دنیا کی متاع اور اس کی زینت ہے اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ بہتر اور پائیدار ہے۔ تو کیا تم سمجھتے نہیں! کیا وہ جس سے ہم نے ایک خوش آئند وعدہ کر رکھا ہے پس وہ اس موعود کو لازماً پا کے رہے گا اس کے مانند ہو گا جس کو ہم نے حیاتِ دنیا کی متاع دی ہے پھر وہ قیامت کے دن حاضر کیے جانے والوں میں سے بننے والا ہے۔ ۶۰-۶۱

۳- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَلَوْلَآ اَنْ تُصِيْبَهُمْ مُّصِيْبَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ فَيَقُوْلُوْا رَبَّنَا لَوْلَآ اَرْسَلْتَ اِلَيْنَا رَسُوْلًا فَنَتَّبِعَ اٰيٰتِكَ وَنَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ (۴۷)

'لَوْلَا' کا جواب، اگر قرینہ واضح ہو تو حذف ہو جایا کرتا ہے۔ یہاں بھی حذف ہے۔ ترجمہ میں ہم نے اس کو کھول دیا ہے۔

بنی اسماعیل پر احسان اور ان کو تنبیہ

یہ قریش یا بالفاظ دیگر بنی اسماعیل پر امتنان بھی ہے اور ان کو تنبیہ بھی۔ مطلب یہ ہے کہ اگر ہم چاہتے تو بغیر کسی رسول کی بعثت کے بھی، ان کے اعمال کی پاداش میں، ان کو پکڑ لیتے لیکن ہم نے ایسا نہیں کیا تاکہ وہ یہ عذر نہ کر سکیں کہ اگر ہمارے پاس خدا کوئی رسول بھیجتا تو ہم اللہ کی آیات کی پیروی کرنے والے اور رسول پر ایمان لانے والے بنتے۔ ان کے اس عذر کو ختم کر دینے اور ان پر حجت تمام کر دینے کے لیے ہم نے ان کے اندر اپنا رسول بھی بھیج دیا ہے۔ اب اگر انھوں نے اس نعمت کی قدر نہ کی تو یاد رکھیں کہ ان پر اللہ کی حجت پوری ہو چکی ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل اور فطرت کی جو روشنی عطا فرمائی ہے وہ بھی انسان کو گمراہی اور بدعملی کی زندگی سے بچانے کے لیے کافی ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ مجرد اس فطری ہدایت ہی کی بنا پر لوگوں کو ان کی بدعملیوں کی سزا دیتا تو یہ بات عدل کے خلاف نہ ہوتی لیکن مزید اتمام حجت و قطع عذر کے لیے اس نے اپنے رسول بھی بھیج دیے جن کے بعد کسی کے لیے کوئی عذر باقی نہیں رہا۔ اسی وجہ سے سنت الٰہی ہمیشہ یہ رہی ہے کہ جس قوم نے بھی رسول کی تکذیب کی وہ صفحۂ ہستی سے مٹا دی گئی۔

فَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوْا لَوْلَآ اُوْتِيَ مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى ؕ اَوَلَمْ يَكْفُرُوْا بِمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى مِنْ قَبْلُ ۚ قَالُوْا سِحْرٰنِ تَظٰهَرَا ۟ وَقَالُوْٓا اِنَّا بِكُلٍّ كٰفِرُوْنَ (۴۸)

لفظ 'حق' یہاں رسول اور کتاب دونوں پر مشتمل ہے اس لیے کہ یہ دونوں چیزیں اپنی حقیقت کے اعتبار سے بالکل ایک ہیں۔ 'مِنْ عِنْدِنَا' اس حق کی عظمت و شان کے اظہار کے لیے ہے کہ یہ خدا کی طرف سے آیا ہوا حق ہے اس وجہ سے اب وہ سب کچھ جو اس کے خلاف ہے باطل اور مٹ جانے والی چیز ہے۔

یہود کا سکھایا ہوا ایک اعتراض اور اس کا جواب

فرمایا کہ ہم نے تو اتمام حجت، قطع عذر اور شکوک و اوہام کے ازالہ کے لیے خاص اپنے پاس سے حق نازل فرمایا لیکن یہ لوگ یہ معارضہ کر رہے ہیں کہ ان (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کو اس طرح کے معجزے کیوں نہیں دیے گئے جس قسم کے حضرت موسیٰؑ کو دیے گئے!

قرینہ دلیل ہے کہ اس اعتراض کو پھیلایا تو قریش نے لیکن اس کے سکھانے والے یہود تھے۔ آگے کی آیات سے واضح ہو جائے گا کہ اس دور میں یہود نے قریش کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف اکسانے

کے لیے در پردہ ریشہ دوانیاں شروع کر دی تھیں۔ یہ انھی کا چھوڑا ہوا شوشہ ہے۔ انھوں نے قریش کو یہ سکھایا کہ یہ اللہ کے رسول ہونے کے مدعی ہیں لیکن رسول یوں ہی نہیں آیا کرتے۔ ہمارے رسول کو تو فلاں فلاں معجزے عطا ہوئے تھے تو آخر اللہ تعالیٰ نے اس طرح کا کوئی معجزہ ان کو کیوں نہیں دیا۔ قریش اپنی سادہ لوحی کے سبب سے یہود کی چال نہ سمجھ سکے اور بے سمجھے بوجھے یہ اعتراض بھی انھوں نے نقل کرنا شروع کر دیا۔ قرآن نے یہاں اسی کا جواب دیا ہے۔ فرمایا اَوَلَمْ یَکْفُرُوْا بِمَآ اُوْتِیَ مُوْسٰی مِنْ قَبْلُ 'کیا انہی کے بھائی بندوں نے ان معجزات کا انکار نہیں کیا جو حضرت موسیٰؑ کو دیے گئے۔ یہاں فعل کی نسبت مشابہت قلوب کی بنا پر کی گئی ہے۔ عربی میں فعلوں اور ضمیروں کا اس طرح استعمال معروف ہے۔ اس کی مثالیں پیچھے بھی گزر چکی ہیں۔ یعنی جب ان کے دلوں کے اندر بھی وہی رعونت ہے جو فرعونیوں کے دلوں میں تھی تو ان کا عمل گویا انہی کا عمل ہے۔ اس جواب کی بلاغت کا صحیح اندازہ کرنے کے لیے اس بات کو بھی پیش نظر رکھیے جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے کہ اس اعتراض کے سکھانے والے دراصل یہود تھے۔

'قَالُوْا سِحْرٰنِ تَظٰهَرَا' لفظ 'سحر' یہاں 'ساحر' کے مفہوم میں ہے لیکن اس کے اندر مبالغہ کا مفہوم پیدا ہو گیا ہے جس طرح 'زید عدل' استعمال ہوتا ہے۔ اور 'تظاہر' کے معنی تعاون اور گٹھ جوڑ کرنے کے ہیں۔ یعنی حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ نے جو شاندار معجزے دکھائے تو ان پر ایمان لانے کے بجائے فرعون اور اس کے اعیان نے کہا کہ یہ دونوں بڑے ماہر جادوگر ہیں اور انھوں نے ہمارے خلاف گٹھ جوڑ کر لیا ہے۔ 'وَقَالُوْٓا اِنَّا بِکُلٍّ کٰفِرُوْنَ' یعنی خواہ یہ کچھ ہی کرتب دکھائیں اور کتنا ہی زور لگائیں ہم ان پر ایمان لانے والے نہیں ہیں۔ ہم ان دونوں کے بھی منکر ہیں اور ان کے ان سارے کرشموں کے بھی۔

قُلْ فَاْتُوْا بِکِتٰبٍ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ هُوَ اَهْدٰی مِنْهُمَآ اَتَّبِعْهُ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ (۴۹)

قریش سے ایک مطالبہ

یعنی یہ لوگ مخالفت کے جوش میں حضرت موسیٰؑ کے معجزات اور ان کے فضل و کمال کا حوالہ تو دیتے ہیں لیکن یہ محض تمھارے اوپر اعتراض کے لیے ایک بہانہ ہے۔ اگر ان کی اس بات میں سچائی کا کوئی شائبہ ہے تو آخر یہ حضرت موسیٰؑ پر ایمان لانے والے کیوں نہ بنے! تو ان سے کہو کہ اگر ان دونوں (یعنی قرآن اور تورات) سے بھی زیادہ ہدایت بخشنے والی کوئی کتاب ہے تو اس کو لاؤ، میں اس کی پیروی کرنے کو تیار ہوں۔

ہدایت کی جستجو فطرت کا تقاضا ہے

مطلب یہ ہے کہ ہدایت کی جستجو تو ہر سلیم الفطرت انسان کی فطرت کا ایک بدیہی تقاضا ہے۔ جس کے اندر ہدایت کی جستجو نہیں ہے وہ جوہر انسانیت سے عاری ہے۔ فطرت کے اسی تقاضے کے تحت میں تورات کو بھی مانتا ہوں اور اس سے زیادہ ہدایت بخشنے والے قرآن کو بھی۔ اور اگر تم ان دونوں سے بھی زیادہ ہدایت بخش کوئی کتاب پیش کرو تو میں اس کی پیروی کے لیے بھی آمادہ ہوں لیکن تمھارا ماجرا عجیب ہے کہ تم نہ تو تورات کو مانتے، نہ قرآن کو البتہ مجھ سے معارضہ کرنے کے لیے یہ اعتراض لے کر اٹھ کھڑے ہوئے ہو کہ میں اس طرح کے معجزے کیوں نہیں دکھاتا جس طرح کے معجزے حضرت موسیٰؑ نے دکھائے۔ 'اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ' یعنی

حضرت موسیٰ کی حمایت میں تمہارا یہ جوش وخروش محض ہدایت سے فرار کے لیے ایک بہانہ ہے ورنہ اس کے کیا معنی کہ پیرو تو تم نہ موسیٰ کے بنتے ہو اور نہ میرے، البتہ یہ اعتراض تمہیں ہے کہ میرے اندر حضرت موسیٰ کے کمالات نہیں ہیں۔

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ قرآن تورات کا مکذب نہیں بلکہ اس کا مصدق ہے۔ قرآن اگر تردید کرتا ہے تو صرف اس کی تحریفات کی تردید کرتا ہے۔ تورات کے مقابل میں قرآن کا دعویٰ یہ نہیں ہے کہ صرف وہی ہدایت کا صحیفہ ہے بلکہ وہ صرف اپنے اَھْدٰی مِنْھُمَا ہونے کا مدعی ہے۔ اس کی وجہ ایک تو یہ ہے کہ اس نے اللہ کی ہدایت کو تمام تحریفات سے پاک کر کے پیش کیا ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ وہ خدا کی آخری اور کامل ہدایت کا صحیفہ ہے جس کی پیشین گوئی خود تورات میں بھی موجود ہے۔

فَاِنْ لَّمْ یَسْتَجِیْبُوْا لَکَ فَاعْلَمْ اَنَّمَا یَتَّبِعُوْنَ اَھْوَآءَھُمْ ؕ وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ ھَوٰىہُ بِغَیْرِ ھُدًی مِّنَ اللّٰہِ ؕ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَھْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ (۵۰)

ہدایت کی پیروی نہ کرنے والا اپنی خواہشات کا پیرو ہے۔

یعنی اگر تمہارے اس چیلنج کے جواب میں یہ ان دونوں سے زیادہ ہدایت بخش کوئی کتاب پیش بھی نہیں کرتے اور ان میں سے کسی کی پیروی کے لیے بھی تیار نہیں ہیں تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ وہ اپنے نفس کی خواہشوں کی پیروی کرنا چاہتے ہیں تو جو اللہ کی ہدایت کے بغیر محض اپنی خواہشوں کا پیرو ہے اس سے بڑھ کر گمراہ اور کون ہو گا! نفس کی خواہشیں صرف اپنے مطالبے پورا کرنا چاہتی ہیں۔ ان کے اندر حق و باطل اور خیر و شر میں امتیاز کی صلاحیت نہیں ہے اور بسا اوقات وہ اتنی زور آور ہو جاتی ہیں کہ بڑی آسانی سے انسان کی عقل کو بھی مغلوب کر لیتی ہیں اس وجہ سے انسان کے لیے فلاح کا واحد راستہ یہ ہے کہ وہ ان خواہشوں کی پیروی اللہ کی ہدایت کی روشنی میں کرے۔ اگر اس روشنی کے بغیر وہ ان کے پیچھے چل پڑے گا تو لازماً وہ ہلاکت کے گڑھے میں گرے گا۔

اِنَّ اللّٰہَ لَا یَھْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے خواہشوں کے اسی مہلکہ سے بچانے ہی کے لیے اپنی ہدایت نازل فرمائی ہے تو بدقسمت ہے وہ جو اس ہدایت کی قدر نہ کرے اور اپنی باگ اندھی بہری خواہشوں کے ہاتھ میں پکڑا دے۔ ایسے لوگ خود اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے ہیں اور سنتِ الٰہی کے بموجب وہ ہدایت سے محروم ہی رہتے ہیں۔

وَلَقَدْ وَصَّلْنَا لَھُمُ الْقَوْلَ لَعَلَّھُمْ یَتَذَکَّرُوْنَ (۵۱)

قرآن اہل کتاب کے لیے جانی پہچانی ہوئی چیز ہے

یعنی اللہ تعالیٰ نے لوگوں کی ہدایت ہی کی خاطر یہ اہتمام فرمایا کہ اپنی تعلیم و تذکیر کے سلسلہ کو کبھی منقطع نہیں ہونے دیا بلکہ اس کے تسلسل کو برابر قائم رکھا۔ حضرت موسیٰ کو جو کتاب عطا ہوئی جب اس کے حاملوں نے اس کو فراموش کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس نعمت سے سرفراز فرمایا۔ اوپر آیات ۴۵-۴۶ میں جو مضمون گزر چکا ہے ایک نئے اسلوب سے یہ اسی کا اعادہ ہے۔ مطلب

یہ ہے کہ یہ قرآن کوئی انوکھی اور متوحش ہونے کی چیز نہیں ہے بلکہ ایک جانی پہچانی ہوئی چیز ہے اس وجہ سے سب سے پہلے تو اہل کتاب کا فرض ہے کہ اس کو ہاتھوں ہاتھ لیں اس لیے کہ جو نعمت ان کو پہلے ناتمام شکل میں ملی تھی اب وہ اپنی کامل شکل میں ان کو دی جا رہی ہے۔ پھر بنی اسماعیل کی سعادت بھی اسی میں ہے کہ اس کو سینہ سے لگائیں اس لیے کہ اب اللہ تعالیٰ نے ان کو براہِ راست اپنی نعمت سے نوازا ہے۔ اب تک ان کے اندر نہ کوئی رسول آیا تھا نہ ان کے لیے کوئی کتاب نازل ہوئی تھی۔

اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰھُمُ الْکِتٰبَ مِنْ قَبْلِہٖ ھُمْ بِہٖ یُؤْمِنُوْنَ ۔ وَاِذَا یُتْلٰی عَلَیْھِمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِہٖٓ اِنَّہُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّنَآ اِنَّا کُنَّا مِنْ قَبْلِہٖ مُسْلِمِیْنَ (۵۲ - ۵۳)

صالحینِ اہلِ کتاب کے رویہ کی تحسین

'اٰتَیْنٰھُمُ الْکِتٰبَ' سے صالحین اہلِ کتاب مراد ہیں۔ ان کے لیے معروف کے صیغہ کا استعمال بھی، جیسا کہ اس کے محل میں ہم وضاحت کر چکے ہیں، اس بات کا قرینہ ہے اور قرآن کے باب میں ان کا رویہ بھی، جو یہاں مذکور ہوا ہے، اس پر شاہد ہے۔

یہ قرآن کے حق میں ایک سند کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ اگر لاخیرے و ناقدرے قسم کے لوگ اس قرآن سے بدک رہے ہیں تو اس کی پروا نہیں کرنی چاہیے۔ آخر صالحین اہل کتاب بھی تو ہیں جو اس نعمت کی قدر کر رہے ہیں اور آگے بڑھ کر اس پر ایمان لا رہے ہیں! ان کا حال تو یہ ہے کہ جب ان کو یہ کتاب سنائی جاتی ہے تو وہ پکار اٹھتے ہیں کہ بے شک یہی حق ہے ہمارے رب کی جانب سے اور ہم تو اس کے پہلے سے ماننے والے رہے ہیں۔

'اِنَّہُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّنَآ' میں جو حصر و تاکید ہے وہ اس بات پر دلیل ہے کہ قرآن نے پچھلے صحیفوں کی جن تحریفات سے پردہ اٹھایا ان کے باب میں بھی انھوں نے اپنی قوم کے مفسدین کے علی الرغم، صدقِ دل سے قرآن کے بیان کی تائید کی اور ساتھ ہی قریش کے لیڈروں کو بھی انھوں نے رہنمائی دی کہ قرآن بالکل حق اور خدائی کتاب ہے اس وجہ سے وہ اس کی قدر کریں، اس کی مخالفت کر کے اپنی شامت کو دعوت نہ دیں۔

'اِنَّا کُنَّا مِنْ قَبْلِہٖ مُسْلِمِیْنَ' یعنی ہم تو اس کے نزول سے پہلے ہی سے اپنے صحیفوں کی پیشین گوئیوں کی بنا پر اس کے ماننے والے رہے ہیں۔ یہ مضمون بقرہ ۱۴۶، انعام ۱۱۴ میں بھی گزر چکا ہے۔ ایک نظر ان پر بھی ڈال لیجیے۔ لفظ 'مسلمین' سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ہم پہلے ہی سے اپنے آپ کو اس کتاب اور اس رسول کے حوالے کر دینے کے لیے منتظر تھے چنانچہ جب ہم نے ان کو پایا تو ان کی اطاعت میں داخل ہو گئے۔

اُولٰٓئِکَ یُؤْتَوْنَ اَجْرَھُمْ مَّرَّتَیْنِ بِمَا صَبَرُوْا وَیَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَۃِ السَّیِّئَۃَ وَمِمَّا رَزَقْنٰھُمْ یُنْفِقُوْنَ (۵۴)

فرمایا کہ یہ لوگ ہیں جو اپنی اس استقامت کے صلہ میں دہرا اجر پائیں گے۔ ایک اجر تو انھیں اس بات کا ملے گا کہ ان کو جو دین حضرت موسیٰ کے ذریعہ سے ملا، اپنی قوم کے عام بگاڑ کے باوجود، وہ اس پر ثابت قدم

رہے۔ دوسرا اس بات کا کہ جس نبی خاتم اور دینِ کامل کی پیشین گوئی حضرت موسیٰؑ و حضرت عیسیٰؑ اور دوسرے انبیاء علیہم السلام نے کی تھی وہ برابر اس کے لیے چشم براہ رہے اور جب وہ آیا تو انھوں نے یوسفِ گم گشتہ کی طرح اس کا استقبال کیا۔ 'بِمَا صَبَرُوْا' کی صفت کے حوالہ کا یہاں ایک خاص محل ہے جس کو نگاہ میں رکھیے۔ وہ یہ کہ ان لوگوں کو اپنے سابق دین پر قائم رہنے کے لیے بھی بڑے زہرہ گداز مصائب کا مقابلہ کرنا پڑا تھا اور جب انھوں نے اسلام قبول کیا تو ان کو اپنی قوم اور قریش دونوں کی مخالفت سے دوچار ہونا پڑا لیکن ان تمام مخالفتوں کا انھوں نے پوری پامردی سے مقابلہ کیا۔ نصاریٰ میں سے شمعون کے پیرووں نے اپنی قوم کے مبتدعین و محرفین کے ہاتھوں جو مصائب جھیلے ان کی تفصیل تاریخ کی کتابوں میں بھی موجود ہے اور ہم نے بھی اس کتاب میں جگہ جگہ اس کا ذکر کیا ہے۔ یہی اہلِ حق تھے جن کو قرآن کی دعوت قبول کرنے کی توفیق حاصل ہوئی اور قرآن نے متعدد سورتوں میں ان کی حق دوستی و ثابت قدمی کی تعریف فرمائی ہے۔

صالحینِ اہلِ کتاب کا کردار

'وَيَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ'۔ 'حَسَنَةٌ' سے مراد یہاں صبر و عزیمت اور عفو و درگزر ہے اور 'سَيِّئَةٌ' سے مخالفین کے اعتراضات و مطاعن اور ان کے سب و شتم کی طرف اشارہ ہے۔ ان لوگوں نے جب اپنے قبولِ اسلام کا اظہار کیا تو ان کی قوم نے بھی ان کو دینِ آبائی کا دشمن اور ملت کا غدار قرار دیا اور دوسرے اعدائے حق نے بھی ان کو اپنے لعن طعن کا ہدف بنا لیا لیکن ان لوگوں نے ہر حملہ کا جواب مومنانہ شرافت اور کریمانہ عفو و درگزر سے دیا۔

'وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ' کا بھی یہاں ایک خاص محل ہے جس کو نگاہ میں رکھنا چاہیے۔ قرآن نے جگہ جگہ اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ اہلِ کتاب بالخصوص یہود کے لیے قبولِ اسلام کی راہ میں جو چیز سب سے بڑی رکاوٹ بنی وہ ان کی زر پرستی ہے۔ اس سورہ میں بھی آگے ان کے قارون کا ذکر آ رہا ہے اور دوسری سورتوں میں بھی ان کی قارونی اور قارون پرستانہ ذہنیت کا ذکر بار بار ہوا ہے۔ جن لوگوں کو زر پرستی کا روگ لگ جاتا ہے وہ کبھی حق قبول کرنے کی ہمت نہیں کر سکتے۔ سیدنا مسیحؑ نے فرمایا کہ جس طرح اونٹ سوئی کے ناکے میں نہیں جا سکتا اسی طرح دولت مند خدا کی بادشاہی میں نہیں داخل ہو سکتا۔ سورۂ لہب سے واضح ہوتا ہے کہ ابولہب کی عداوتِ اسلام میں بھی سب سے زیادہ دخل اس کی زر پرستی اور حرصِ مال ہی کو تھا۔ یہاں ان صادقین کی صفت 'مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ' کا حوالہ دے کر قرآن اسی حقیقت کو واضح کرنا چاہتا ہے کہ ان لوگوں کو طمعِ مال کی بیماری نہیں لگی تھی اس وجہ سے ان کو قبولِ اسلام کی توفیق حاصل ہوئی۔

وَاِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ اَعْرَضُوْا عَنْهُ وَقَالُوْا لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ لَا نَبْتَغِي الْجٰهِلِيْنَ (۵۵)

مخالفین سے اعراض

یہ 'يَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ' کی مزید وضاحت ہے کہ یہ لوگ جب مخالفین کی بکواس سنتے ہیں

تو ان سے الجھنے کے بجائے اعراض کرتے ہیں۔ وَقَالُوْا لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ' یہ اُن کے اعراض کا طریقہ بیان ہوا ہے کہ جب مخالفین و معترضین ان سے الجھتے ہیں تو وہ ان سے یہ کہہ کر پیچھا چھڑانے کی کوشش کرتے ہیں کہ اچھا بھائی! زیادہ بحث و جدال سے کیا فائدہ، ہم اپنے اعمال کے ذمہ دار ہیں، آپ اپنے اعمال کے ذمہ دار ہو، ہمیں ہماری اختیار کردہ راہ پر چلنے دو، آپ اپنی راہ پر چلو!

'سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ' یہ سلام، مفارقت کے مفہوم میں ہے جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ کو سلام کیا تھا۔ یہ کسی سے پیچھا چھڑانے کا ایک نہایت شائستہ طریقہ ہے۔ 'لَا نَبْتَغِي الْجٰهِلِيْنَ' یہ ان کے طرزِ عمل کی تعبیر ہے کہ وہ دل میں یہ خیال کر کے کہ جاہلوں سے الجھنے سے کچھ فائدہ نہیں، ان کو سلام کر کے رخصت ہو جاتے ہیں۔ اس طریقۂ تعبیر کی متعدد مثالیں قرآن مجید میں موجود ہیں۔ بسا اوقات آدمی کا طرزِ عمل ہی اس کے قول کا قائم مقام بن جاتا ہے۔

اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ (۵۶)

آنحضرتؐ کو تسلی

'ھدایت' یہاں ہدایت یافتہ بنا دینے کے مفہوم میں ہے۔ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی کہ تم ان لوگوں کے پیچھے زیادہ ہلکان نہ ہو۔ تمہارا کام صرف لوگوں تک پیغامِ حق پہنچا دینا ہے۔ یہ تمہارے اختیار میں نہیں ہے کہ تم جس کو چاہو ہدایت یافتہ بنا دو بلکہ یہ اللہ کے اختیار میں ہے کہ وہ جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔ اللہ ہی خوب جانتا ہے کہ کون ہدایت پانے کا اہل ہے، کون نہیں ہے۔ ہدایت و ضلالت کے باب میں جو سنتِ الٰہی ہے اس کی وضاحت ہم برابر کرتے آ رہے ہیں۔

وَقَالُوْٓا اِنْ نَّتَّبِعِ الْهُدٰى مَعَكَ نُتَخَطَّفْ مِنْ اَرْضِنَا ۭ اَوَلَمْ نُمَكِّنْ لَّهُمْ حَرَمًا اٰمِنًا يُّجْبٰٓى اِلَيْهِ ثَمَرٰتُ كُلِّ شَيْءٍ رِّزْقًا مِّنْ لَّدُنَّا وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ (۵۷)

خدائی نظام کی مخالفت کے لیے شیاطین کا مخصوص حربہ

یہ قریش کے ایک اور اعتراض کو نقل کر کے اس کا جواب دیا ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ اگر اس دین کو قبول کرنے کے معاملے میں ہم تمہارے ساتھی بن جائیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم اپنے گرد و پیش کی ساری دنیا کو اپنا دشمن بنا لیں اور یہ دشمن مل کر ہمیں ہمارے اس ملک سے اچک لے جائیں۔

قریش کو پورے ملک پر جو اقتدار حاصل تھا وہ سمجھتے تھے کہ یہ ان کے دینِ شرک کی برکت سے ان کو حاصل ہوا ہے۔ وہ اپنے دیویوں دیوتاؤں کو تو تمام خیر و برکت کا ذریعہ مانتے ہی تھے۔ مزید برآں انھوں نے پورے ملک پر اپنی مذہبی و سیاسی دھاک قائم رکھنے کے لیے یہ تدبیر اختیار کی تھی کہ تمام قبائلِ عرب کے اصنام خانہ کعبہ میں جمع کر دیے تھے اور اس طرح گویا وہ سب کے امام و پیشوا بن گئے تھے۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوتِ توحید بلند کی تو اس کے خلاف انھوں نے اپنی قوم کو یہ کہہ کر بھی بھڑکایا کہ اگر ہم اپنے تمام دیویوں دیوتاؤں کو چھوڑ کر صرف ایک خدا کے بن کر رہ جائیں تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہماری تمام جمعیت پارہ پارہ ہو جائے گی، تمام عرب ہمارا دشمن بن کر اٹھ کھڑا ہوگا اور اس ملک سے ہماری جڑ

اکھڑ جائے گی۔ یہ بعینہٖ وہی اعتراض ہے جو آج ہمارے لیڈر حضرات اسلامی نظام، اسلامی معاشرت، اسلامی حدود و تعزیرات اور اسلامی نظامِ معیشت کے خلاف اٹھاتے ہیں کہ اگر ہم ان کو اختیار کر لیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اپنے تمام نظامِ معیشت و معاشرت کا تیا پانچہ کر کے رکھ دیں اور ساری دنیا میں نکّو بن کے رہ جائیں۔ یاد ہوگا یہی اعتراض فرعون اور اس کے اعیان نے حضرت موسیٰؑ کی تعلیم و دعوت کے خلاف بھی اٹھایا تھا کہ یہ شخص ہماری اعلیٰ تہذیب (طَرِيقَتِكُمُ الْمُثْلَىٰ) کو مٹانے کے درپے ہے۔ خدائی نظام کی مخالفت [illegible] سے زیادہ کارگر حربہ ہمیشہ سے یہی رہا ہے۔

بیت اللہ کی برکات

أَوَلَمْ نُمَكِّن لَّهُمْ حَرَمًا آمِنًا يُجْبَىٰ إِلَيْهِ ثَمَرَاتُ كُلِّ شَيْءٍ رِّزْقًا مِّن لَّدُنَّا۔ یہ ان کے اعتراض کا جواب دیا کہ ان بے خبروں کو پتہ نہیں کہ جس زمانے میں حضرت ابراہیمؑ نے اپنی ذریت کو اس سرزمین میں بسایا ہے نہ یہاں کسی کی جان کے لیے امان تھی، نہ زندگی بسر کرنے کے معاشی وسائل ہی یہاں موجود تھے لیکن حضرت ابراہیمؑ نے اس گھر کو بسایا اور اس کے ساکنوں کے لیے رزق و امن کی دعا کی جس کی برکت سے یہ حال ہوا کہ آج یہ علاقے بے ہر قسم کی پیداوار یہاں کھنچی چلی آ رہی ہے۔ حج اور اشہرِ حُرم کی بدولت مکہ کی رفاہیت میں جو برکتیں ظاہر ہوئیں ان پر پچھلی سورتوں میں ہم روشنی ڈال چکے ہیں۔ یہ انہی کی طرف اشارہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ ساری برکتیں حاصل تو ہوئیں ان کو اللہ کے فضل اور حضرت ابراہیمؑ کی دعا کی برکت سے لیکن آج ان شامت زدوں کا حال یہ ہے کہ یہ سمجھتے ہیں کہ اگر انھوں نے اس دین کو اختیار کر لیا جس کی قرآن دعوت دے رہا ہے اور جو اصلاً حضرت ابراہیمؑ ہی کا دین ہے، تو یہ تباہ ہو کے رہ جائیں گے!

وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ۔ یہ ان کے حال پر اظہارِ افسوس ہے کہ ان کی اکثریت آج اپنی تاریخ سے کس درجہ بے خبر ہو کر رہ گئی ہے۔

سورۂ عنکبوت میں یہی مضمون اس طرح بیان ہوا ہے۔

أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا آمِنًا	کیا انھوں نے دیکھا نہیں کہ ہم نے ان کے لیے تو ایک
وَيُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ	مامون حرم بنایا اور ان کے گرد و پیش کا حال یہ ہے
أَفَبِالْبَاطِلِ يُؤْمِنُونَ وَبِنِعْمَةِ	کہ لوگ اچک لیے جاتے ہیں تو کیا وہ باطل پر ایمان
اللَّهِ يَكْفُرُونَ (عنکبوت: ۶۷)	رکھتے ہیں اور اللہ کی نعمت کی ناشکری کرتے ہیں۔

لفظ 'ثَمَرَاتٌ' پر ہم سورۂ بقرہ کی تفسیر میں بحث کر چکے ہیں کہ یہ صرف 'فواکہ' کے لیے نہیں آتا بلکہ ہر قسم کی غذائی اجناس کے لیے بھی آتا ہے۔

نُمَكِّن لَّهُمْ حَرَمًا آمِنًا۔ اسی طرح کی ترکیب ہے جس طرح سورۂ نور میں وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضَىٰ لَهُمْ (۵۵) ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے اور تاریخ اس پر شاہد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس حرم کو بجائے خود بالکل محفوظ و مامون بنایا ہے۔ یہ دوسروں کی حفاظت کا محتاج نہیں بلکہ خود دوسروں

کا محافظ ہے۔ سورۂ قریش میں ان شاء اللہ اس حقیقت کی وضاحت ہم تفصیل سے کریں گے۔

وَكَمْ أَهْلَكْنَا مِن قَرْيَةٍ بَطِرَتْ مَعِيشَتَهَا ۖ فَتِلْكَ مَسَاكِنُهُمْ لَمْ تُسْكَن مِّن بَعْدِهِمْ إِلَّا قَلِيلًا ۖ وَكُنَّا نَحْنُ الْوَارِثِينَ (۵۸)

غریب لفظ کا ایک اسلوب

'بطر' کے معنی اکڑنے، اترانے اور فخر و ناز کرنے کے ہیں۔ چونکہ اس کا استعمال بطور متعدی معروف نہیں ہے اس وجہ سے 'مَعِيشَتَهَا' کے نصب کے بارے میں بڑا اختلاف ہے۔ عام طور پر لوگوں نے یہاں یا تو حرف جر محذوف مانا ہے یا ظرف۔ استاذ امامؒ کا رجحان یہ معلوم ہوتا ہے کہ 'مَعِيشَتَهَا'، 'أَهْلَكْنَا' کا مفعول ہے۔ لیکن مجھے ان اقوال میں سے کسی قول پر بھی اعتماد نہیں ہے۔ بعضوں نے 'بَطِرَتْ' کو 'كَفَرَتْ' کے مضمون پر متضمن قرار دیا ہے۔ یہ رائے اقرب الی الصواب ہے۔ عربی میں 'بَطِرَ الْحَقَّ' کا استعمال 'تَكَبَّرَ عَنْهُ' کے مفہوم میں معروف ہے۔ یعنی اس نے حق سے متکبرانہ اعراض کیا۔ اسی طرح اگر کہیں 'بَطِرَ فُلَانٌ النِّعْمَةَ' تو اس کا مفہوم ہوگا 'اسْتَخَفَّهَا فَكَفَرَهَا' (اس نے اس نعمت کو حقیر سمجھ کر اس کی ناشکری کی) میرے نزدیک ان استعمالات کی بنیاد تضمین ہی کے اصول پر ہے اور آیت میں بھی یہ لفظ اسی اصول پر استعمال ہوا ہے۔

رفاہیت پر اترانے والی قوموں کا انجام

یہ قریش کو انذار و تنبیہ ہے کہ تم سمجھتے ہو کہ اس سرزمین میں تم کو جو امن و رفاہیت حاصل ہے یہ تمہاری اپنی تدبیر و تدبر کا کرشمہ ہے اس وجہ سے تمہیں اس پر بڑا ناز و فخر ہے حالانکہ یہ جو کچھ تمہیں حاصل ہوا ہے خدا ہی کے فضل و کرم سے حاصل ہوا ہے۔ اس کا حق یہ ہے کہ تم اس پر اترانے کے بجائے خدا کے شکرگزار بنو ورنہ یاد رکھو کہ تم سے پہلے کتنی قومیں گزری ہیں جو تمہاری ہی طرح خدا کی نعمتوں کو اپنا حق سمجھ کر ان پر اترائیں تو اس کی پاداش میں ہم نے ان کو ہلاک کر دیا اور ان کی بستیاں تم سے دور نہیں ہیں۔ تم ان پر سے گزرتے ہو۔

'تِلْكَ' اس بات کا قرینہ ہے کہ یہ بستیاں مخاطب کی جانی پہچانی ہوئی ہیں۔ یہ اشارہ ثمود اور قوم لوط وغیرہ کی بستیوں کی طرف ہے جو قریش کی تجارتی گزرگاہوں پر تھیں۔ 'لَمْ تُسْكَن مِّن بَعْدِهِمْ إِلَّا قَلِيلًا' میں میرے نزدیک وہی مضمون ہے جو سورۂ ہود میں بدیں الفاظ گزر چکا ہے۔ 'ذَٰلِكَ مِنْ أَنبَاءِ الْقُرَىٰ نَقُصُّهُ عَلَيْكَ ۖ مِنْهَا قَائِمٌ وَحَصِيدٌ (۱۰۰)' (یہ بستیوں کی سرگزشتیں ہیں جو ہم تمہیں سنا رہے ہیں۔ ان میں سے بعض قائم ہیں اور بعض ختم ہو چکی ہیں) وہاں ہم اس آیت کی تفسیر کر چکے ہیں اس پر ایک نظر ڈال لیجیے۔ میرے نزدیک عربیت کے اعتبار سے یہ مفہوم لینے میں کوئی خرابی نہیں ہے۔ ویسے اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان بستیوں کا سارا کرّوفر تو اجڑ گیا یہ الگ بات ہے کہ کبھی گڈریوں، چرواہوں اور خانہ بدوشوں نے ان میں اپنے ڈیرے ڈال لیے ہوں تو ڈال لیے ہوں۔

'وَكُنَّا نَحْنُ الْوَارِثِينَ' یعنی وہ تو سب فنا ہو گئے جو اپنے آپ کو ان کا مالک و حکمران گمان

کرتے تھے اور ان کی وراثت ہماری طرف لوٹ آئی اس لیے کہ تمام آسمان و زمین کے حقیقی مالک و وارث ہم ہی ہیں۔

وَمَا كَانَ رَبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى حَتّٰى يَبْعَثَ فِيْٓ اُمِّهَا رَسُوْلًا يَّتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا ۚ وَمَا كُنَّا مُهْلِكِي الْقُرٰٓى اِلَّا وَاَهْلُهَا ظٰلِمُوْنَ (۵۹)

ہلاکت پیغمبر کی بعثت کے بعد

یہ وہی انذار کا مضمون مزید واضح اور تیز ہو گیا ہے۔ فرمایا کہ قوموں پر فیصلہ کن عذاب کے معاملے میں سنتِ الٰہی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس وقت تک کسی قوم کو ہلاک نہیں کرتا جب تک اس کی مرکزی بستی میں اپنا ایک رسول بھیج کر لوگوں کو اپنی آیات اچھی طرح سنا نہ دے۔ مطلب یہ ہے کہ جہاں تک قریش کا تعلق ہے اس سنتِ الٰہی کا ایک مرحلہ پورا ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی مرکزی بستی — مکہ — میں اپنا ایک رسول بھیج دیا جو رات دن لوگوں کو اللہ کی آیات کے ذریعے سے انذار کر رہا ہے۔ اب عذاب کا انحصار ان کے رویہ پر ہے۔

وَمَا كُنَّا مُهْلِكِي الْقُرٰٓى اِلَّا وَاَهْلُهَا ظٰلِمُوْنَ۔ یہ اسی سنتِ الٰہی کے دوسرے مرحلے کا ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی بستی کو ہلاک نہیں کرتا جب تک اس کے باشندے اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے نہ بن جائیں — 'ظلم ڈھانے' سے مراد یہ ہے کہ رسول کی اس تمام تذکیر و تنبیہ کے بعد بھی وہ اپنے شرک و کفر پر اڑے ہی رہیں اور رسول کی تکذیب کر دیں۔ مطلب یہ ہوا کہ اب قریش اور ان کے اعوان و انصار کے لیے یہ آخری مرحلہ درپیش ہے۔ اگر انھوں نے رسول کی قدر نہ پہچانی، اپنی ضد پر اڑے رہ گئے، تو ایک خاص وقت تک مہلت دینے کے بعد وہ لازماً عذابِ الٰہی کی زد میں آ جائیں گے اور یہ خدا کی طرف سے ان پر کوئی ظلم نہیں ہو گا بلکہ وہ خود اپنے اوپر ظلم ڈھانے والے بنیں گے۔

وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَزِيْنَتُهَا ۚ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (۶۰)

قریش کو براہِ راست تنبیہ

اوپر کی تنبیہات بالواسطہ تھیں۔ اب یہ براہِ راست قریش کے لیڈروں کو مخاطب کر کے متنبہ فرمایا کہ جو رفاہیت و خوش حالی تمھیں حاصل ہے اس پر اتراؤ نہیں۔ یہ جو کچھ بھی ہے بس حیاتِ چند روزہ کی متاع اور عارضی رونق ہے۔ اصل چیز جو بہتر اور غیر فانی ہے وہ خدا کے پاس ہے جو ان لوگوں کو حاصل ہو گی جو آخرت کے طالب بنیں گے اور اس کے لیے جدوجہد کریں گے تو اس متاعِ عارضی اور وقتی چمک دمک پر ریجھ کر حیاتِ ابدی کے خزانوں کو ضائع نہ کرو۔ عقل سے کام لو۔ 'اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ' کیا تم لوگ اس حقیقت کو نہیں سمجھتے!

اَفَمَنْ وَّعَدْنٰهُ وَعْدًا حَسَنًا فَهُوَ لَاقِيْهِ كَمَنْ مَّتَّعْنٰهُ مَتَاعَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ثُمَّ هُوَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ مِنَ الْمُحْضَرِيْنَ (۶۱)

'احضار' یہاں مجرموں کی طرح پکڑ کر حاضر کیے جانے کے مفہوم میں ہے اس وجہ سے 'مُحْضَرِیْنَ' کے اندر ذلت کے ساتھ حاضر کیے جانے کا مفہوم خود پیدا ہو گیا ہے۔

یعنی سوچو کہ ایک تو وہ لوگ ہیں جن سے اللہ نے آخرت کی ابدی بادشاہی کا وعدہ کر رکھا ہے اور یہ ابدی بادشاہی لازماً پا کے رہیں گے، اس لیے کہ اللہ کے وعدے سے سچا وعدہ کس کا ہو سکتا ہے۔ دوسرے وہ لوگ ہیں جن کو ہم نے حیاتِ چند روزہ کی متاعِ فانی تو دی ہے مگر بالآخر قیامت کے دن نہایت ذلت کے ساتھ وہ خدا کے حضور پیشی کے لیے گھسیٹ کر لائے جائیں گے۔ بتاؤ کہ ان میں سے بہتر اور لازوال (خَیْرٌ وَّاَبْقٰی) انجام والا کون ہو گا!

۴۔ آگے کا مضمون ـــــ آیات ۶۲-۷۵

اب آگے اوپر کے مضمون کی تائید کے لیے شرک اور شرکاء کی تردید ہے کہ اگر کسی نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ آخرت میں ان کے مزعومہ شرکاء و شفعاء کچھ کام آنے والے نہیں گے تو وہ اس وہم کو اپنے دماغ سے نکال دے۔ ان شرکاء کو نہ اس دنیا کے انتظام و انصرام میں کوئی دخل ہے، نہ یہ آخرت میں کام آنے والے ہیں۔ ان بے حقیقت چیزوں کے بل پر جو لوگ قرآن کی دعوت کو جھٹلا رہے ہیں وہ اپنا انجام اچھی طرح سوچ لیں۔ آیات کی تلاوت کیجیے۔

آیات ۶۲-۷۵

وَيَوْمَ يُنَادِيهِمْ فَيَقُولُ أَيْنَ شُرَكَائِيَ الَّذِينَ كُنْتُمْ تَزْعُمُونَ ﴿٦٢﴾ قَالَ الَّذِينَ حَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ رَبَّنَا هٰؤُلَاءِ الَّذِينَ أَغْوَيْنَا أَغْوَيْنَاهُمْ كَمَا غَوَيْنَا ۖ تَبَرَّأْنَا إِلَيْكَ ۖ مَا كَانُوا إِيَّانَا يَعْبُدُونَ ﴿٦٣﴾ وَقِيلَ ادْعُوا شُرَكَاءَكُمْ فَدَعَوْهُمْ فَلَمْ يَسْتَجِيبُوا لَهُمْ وَرَأَوُا الْعَذَابَ ۚ لَوْ أَنَّهُمْ كَانُوا يَهْتَدُونَ ﴿٦٤﴾ وَيَوْمَ يُنَادِيهِمْ فَيَقُولُ مَاذَا أَجَبْتُمُ الْمُرْسَلِينَ ﴿٦٥﴾ فَعَمِيَتْ عَلَيْهِمُ الْأَنْبَاءُ يَوْمَئِذٍ فَهُمْ لَا يَتَسَاءَلُونَ ﴿٦٦﴾ فَأَمَّا مَنْ تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَعَسَىٰ أَنْ يَكُونَ مِنَ الْمُفْلِحِينَ ﴿٦٧﴾ وَرَبُّكَ يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ

وَيَخْتَارُ ۗ مَا كَانَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ ۚ سُبْحٰنَ اللّٰهِ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۶۸﴾ وَرَبُّكَ يَعْلَمُ مَا تُكِنُّ صُدُوْرُهُمْ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ﴿۶۹﴾ وَهُوَ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۗ لَهُ الْحَمْدُ فِى الْاُوْلٰى وَالْاٰخِرَةِ ۫ وَلَهُ الْحُكْمُ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۷۰﴾ قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ جَعَلَ اللّٰهُ عَلَيْكُمُ الَّيْلَ سَرْمَدًا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِضِيَآءٍ ۗ اَفَلَا تَسْمَعُوْنَ ﴿۷۱﴾ قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ جَعَلَ اللّٰهُ عَلَيْكُمُ النَّهَارَ سَرْمَدًا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِلَيْلٍ تَسْكُنُوْنَ فِيْهِ ۗ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ﴿۷۲﴾ وَمِنْ رَّحْمَتِهٖ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۷۳﴾ وَيَوْمَ يُنَادِيْهِمْ فَيَقُوْلُ اَيْنَ شُرَكَآءِيَ الَّذِيْنَ كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ ﴿۷۴﴾ وَنَزَعْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِيْدًا فَقُلْنَا هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ فَعَلِمُوْٓا اَنَّ الْحَقَّ لِلّٰهِ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۷۵﴾

ع ۱۰

ترجمۂ آیات ۶۲-۷۵

اور اس دن کا دھیان کرو جس دن خدا ان کو پکارے گا پھر پوچھے گا کہ میرے وہ شریک کہاں ہیں جن کو تم میرا شریک گمان کرتے رہے ہو! تو جن پر خدا کی بات پوری ہو چکی ہوگی وہ کہیں گے: اے ہمارے رب! یہ لوگ ہیں جن کو ہم نے گمراہ کیا، ہم نے ان کو اسی گمراہ کیا جس طرح ہم خود گمراہ ہوئے۔ ہم تیرے حضور ان سے اعلانِ براءت کرتے ہیں۔ یہ ہم کو نہیں پوجتے رہے ہیں۔ ۶۲-۶۳

اور ان سے کہا جائے گا کہ اب، اپنے شریکوں کو بلاؤ تو وہ ان کو پکاریں گے لیکن وہ ان کو جواب نہ دیں گے اور وہ عذاب سے دوچار ہوں گے، کاش وہ ہدایت اختیار کرنے والے بنے ہوتے! ۶۴

اور اس دن کا دھیان کرو جس دن خدا ان کو پکارے گا اور پوچھے گا کہ تم نے رسولوں کو کیا جواب دیا تو اس دن ان کی سٹی بھول جائے گی تو وہ آپس میں ایک دوسرے سے پوچھ بھی نہ کر سکیں گے۔ ہاں! جس نے توبہ کی اور ایمان لایا اور عمل صالح کیا، وہ توقع ہے کہ فلاح پانے والوں میں سے ہوگا۔ ۶۵-۶۶

اور تیرا رب ہی پیدا کرتا ہے جو چاہتا ہے اور پسند کرتا ہے جو چاہتا ہے۔ ان کو کوئی اختیار حاصل نہیں۔ اللہ پاک و برتر ہے ان چیزوں سے جن کو یہ اس کا شریک ٹھہراتے ہیں۔ اور تیرا رب جانتا ہے جو کچھ وہ اپنے سینوں میں چھپائے ہوئے ہیں اور جو وہ ظاہر کرتے ہیں۔ اور وہی اللہ ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہی شکر کا حق دار ہے دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ اور اسی کے اختیار میں فیصلہ ہے اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔ ۶۸-۷۰

ان سے کہو کہ بتاؤ، اگر اللہ تم پر ہمیشہ کے لیے، تا قیامت رات ہی کو مسلط کر دے تو اللہ کے سوا کون معبود ہے جو تمھارے پاس روشنی لائے گا، تو کیا تم لوگ سنتے نہیں! کہو، تم لوگ بتاؤ، اگر تم پر دن ہی کو ہمیشہ کے لیے، تا قیامت مسلط رکھے تو اللہ کے سوا کون معبود ہے جو تمھارے لیے رات کو لائے گا جس میں تم سکون پاتے ہو۔ تو کیا تم لوگ دیکھتے نہیں! اور اس نے اپنی رحمت ہی سے تمھارے لیے رات اور دن کو بنایا ہے کہ تم اس میں سکون حاصل کرو اور تاکہ تم اس کے فضل کے طالب بنو۔ اور تاکہ تم شکر گزار ہو۔ ۷۱-۷۳

اور اس دن کا خیال کرو جس دن ان کو پکارے گا اور کہے گا کہ کہاں ہیں میرے وہ شریک؟ جن کو تم میرا شریک گمان کرتے تھے۔ اور ہم ہر امت میں سے ایک گواہ کو الگ کریں گے اور لوگوں سے کہیں گے کہ اپنی دلیل پیش کرو تو ان پر واضح ہو جائے گا کہ حق بجانب اللہ ہے۔ اور جو کچھ وہ افترا کرتے رہے تھے وہ سب ہوا ہو جائے گا۔ ۷۴-۷۵

۵۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَيَوْمَ يُنَادِيهِمْ فَيَقُولُ أَيْنَ شُرَكَائِيَ الَّذِينَ كُنْتُمْ تَزْعُمُونَ (۶۲)

شرک اور اہل شرک کا انجام

یہ اور آگے کی تمام آیات مسلسل تنبیہات کی نوعیت کی ہیں جن میں یہ واضح فرمایا گیا ہے کہ قیامت کے دن شرک کرنے والوں، شرک کے داعی لیڈروں اور خود شرکاء کا کیا حشر ہو گا۔ فرمایا کہ اس دن کو نہ بھولو جس دن خدا تمام مشرکین کو اپنی عدالت میں پیشی کے لیے پکارے گا اور ان کو حکم دے گا کہ میرے وہ شرکاء کہاں ہیں جن کو تم میرا شریک گمان کرتے رہے ہو؟ 'أَيْنَ شُرَكَائِيَ' کے ابہام کے اندر مشرکین کے ساتھ ساتھ ان کے مزعومہ شرکاء پر جو قہر و غضب مضمر ہے وہ اصحاب ذوق سے مخفی نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اب ان کو پیش کرو تاکہ تم بھی اور تمھارے ساتھ وہ بھی اپنا انجام دیکھ لیں۔

قَالَ الَّذِينَ حَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ رَبَّنَا هَٰؤُلَاءِ الَّذِينَ أَغْوَيْنَا أَغْوَيْنَاهُمْ كَمَا غَوَيْنَا ۖ تَبَرَّأْنَا إِلَيْكَ ۖ مَا كَانُوا إِيَّانَا يَعْبُدُونَ (۶۳)

گمراہ لیڈروں اور ان کے پیروؤں کی جوتی پیزار

'حَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ' سے مراد مشرکین کے وہ لیڈر ہیں جن کے لیے خدا کا فیصلۂ عذاب صادر ہو جائے گا۔ فرمایا کہ گمراہ لوگ آخری عذر کے طور پر اپنے لیڈروں کی طرف اشارہ کریں گے کہ اے ہمارے رب! دراصل یہ لوگ ہیں جنھوں نے ہمیں گمراہ کیا، اگر یہ ہمیں گمراہ نہ کرتے تو ہم گمراہ نہ ہوتے۔ 'أَغْوَيْنَاهُمْ كَمَا غَوَيْنَا' ان کے لیڈر جھٹ جواب دیں گے کہ ہم جو کچھ خود تھے وہی ہم نے ان کو بنایا، یہ خود شامت زدہ تھے کہ انھوں نے ہماری پیروی کی۔ 'تَبَرَّأْنَا إِلَيْكَ' یعنی ہم ان کے اعمال کی ذمہ داری سے تیرے حضور میں اپنی برأت کا اعلان کرتے ہیں۔ 'مَا كَانُوا إِيَّانَا يَعْبُدُونَ' یہ لوگ ہماری پرستش نہیں کرتے رہے ہیں کہ ہمارے اوپر ان کی کوئی ذمہ داری ہو۔ یہ اپنی آزادی رائے اور اپنی پسند سے ہماری باتیں مانتے رہے ہیں — گمراہ لیڈروں اور ان کے پیروؤں کی یہ جوتی پیزار قرآن مجید میں کئی جگہ مذکور ہوئی ہے۔ ہم ایک مثال اعراف سے پیش کرتے ہیں۔

قَالَ ادْخُلُوْا فِيْٓ اُمَمٍ قَدْ خَلَتْ	حکم ہوگا، داخل ہوجاؤ دوزخ میں ان گروہوں
مِنْ قَبْلِكُمْ مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ	کے ساتھ جو جنوں اور انسانوں میں سے تم سے
فِي النَّارِ ۭ كُلَّمَا دَخَلَتْ اُمَّةٌ لَّعَنَتْ	پہلے داخل ہوئے۔ جب جب داخل ہوگا کوئی گروہ
اُخْتَهَا ۭ حَتّٰٓي اِذَا ادَّارَكُوْا	وہ اپنے ہم مشربوں پر لعنت کرے گا۔ یہاں تک کہ
فِيْهَا جَمِيْعًا ۙ قَالَتْ اُخْرٰىهُمْ	جب سب اس میں اکٹھے ہولیں گے، پچھلے اگلوں
لِاُوْلٰىهُمْ رَبَّنَا هٰٓؤُلَاۗءِ اَضَلُّوْنَا	کے باب میں کہیں گے، اے ہمارے رب!
فَاٰتِهِمْ عَذَابًا ضِعْفًا مِّنَ	یہ لوگ ہیں جنھوں نے ہمیں گمراہ کیا تو ان کو دونا
النَّارِ ڛ قَالَ لِكُلٍّ ضِعْفٌ وَّلٰكِنْ	عذاب دوزخ دے۔ ارشاد ہوگا، تم میں سے
لَّا تَعْلَمُوْنَ ۝ وَقَالَتْ اُوْلٰىهُمْ لِاُخْرٰىهُمْ	ہر ایک کے لیے دونا عذاب ہے لیکن تم جانتے
فَمَا كَانَ لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ فَذُوْقُوا	نہیں۔ اور اگلے پچھلوں سے کہیں گے، تمھیں بھی
الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْسِبُوْنَ ۝	تو ہم پر کوئی فضیلت نہ حاصل ہوئی تو اپنے عمل
(الاعراف ۳۸ - ۳۹)	کی پاداش میں اب عذاب چکھو۔

حٰمٓ السجدۃ، آیت ۲۸ کے تحت ان شاء اللہ، ہم اس کی مزید وضاحت کریں گے۔

وَقِيْلَ ادْعُوْا شُرَكَاۗءَكُمْ فَدَعَوْهُمْ فَلَمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَهُمْ وَرَاَوُا الْعَذَابَ ۚ لَوْ اَنَّهُمْ كَانُوْا يَهْتَدُوْنَ (۶۴)

مشرکین کے معبودوں کی بے حقیقتی

یعنی اپنے جن لیڈروں پر وہ اپنی گمراہی کی ذمہ داری ڈالنا چاہیں گے، جب وہ صاف صاف ان سے اعلانِ براءت کردیں گے تو ان سے پھر کہا جائے گا کہ اب بولو، تمھارے ان لیڈروں نے تو تم سے براءت کا اعلان کردیا تو تمھارے وہ معبود کہاں ہیں جن کی پرستش کرتے رہے ہو! اس وقت وہ گھبرا کر میں اپنے ان شریکوں کو پکاریں گے جن کے وہ بت پوجتے رہے تھے۔ مثلاً لات، منات، عزّیٰ اور نائلہ وغیرہ کو، لیکن وہ ان کی کوئی فریاد رسی نہیں کریں گے۔ اس لیے کہ ان کا سرے سے کوئی وجود ہی نہیں ہوگا۔ وہ محض خیالی ہستیاں تھیں۔ آخرت میں راز کھل جائے گا کہ انھوں نے محض گمان کی پرستش کی۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ یہاں ذکر مشرکینِ عرب کا ہے جن کے تمام اصنام والٰہ محض خیالی اور خود تراشیدہ تھے۔ جن قوموں نے کسی واقعی ہستی کی پرستش کی ہے مثلاً نصاریٰ، جنھوں نے حضرت مسیح علیہ السلام کی پرستش کی، ان کا ذکر قرآن میں الگ ہوا ہے کہ قیامت کے دن حضرت مسیح اپنے پرستاروں سے اعلانِ براءت کردیں گے کہ مجھے کچھ خبر نہیں کہ کچھ احمق لوگوں نے میری پرستش کی ہے۔ میں نے تو سب کو اللہ واحد کی بندگی کی دعوت دی تھی۔

وَرَاَوُا الْعَذَابَ یعنی جن کی شفاعت کی امیدوں پر جیے اور مرے ان کا پکارنا بالکل صدا بصحرا

ثابت ہوگا۔ البتہ خدا کا عذاب سامنے ہوگا اور اس سے انھیں سابقہ پیش آئے گا۔

'لَوْ اَنَّهُمْ كَانُوْا يَهْتَدُوْنَ' یہ ان کے حال پر اظہارِ حسرت و افسوس ہے کہ کاش وہ ہدایت حاصل کرنے والے بنے ہوتے کہ اس عذاب سے دوچار نہ ہوتے۔ اس سے اس عذاب کی ہولناکی اور بے پناہی واضح ہوتی ہے۔

وَيَوْمَ يُنَادِيْهِمْ فَيَقُوْلُ مَاذَآ اَجَبْتُمُ الْمُرْسَلِيْنَ ۝ فَعَمِيَتْ عَلَيْهِمُ الْاَنْۢبَآءُ يَوْمَئِذٍ فَهُمْ لَا يَتَسَآءَلُوْنَ (۶۵-۶۶)

مشرکوں کی بدحواسی قیامت کے دن

یہ بھی روزِ قیامت کے احوال ہی کے سلسلہ کی بات ہے کہ اس دن ملامت کی پکار ہوگی اور ان سے سوال ہوگا کہ خدا نے جو رسول تمھاری ہدایت کے لیے بھیجے ان کی دعوت کا تم نے کیا جواب دیا؟ ظاہر ہے کہ یہ سوال بھی ان سے ان کے جرم کی سنگینی واضح کرنے کے لیے ہوگا کہ خدا نے تو تمھاری ہدایت کے لیے یہ اہتمام فرمایا کہ اپنے رسول بھیجے کہ ہر پہلو سے حق تم پر واضح ہو جائے تو تم بتاؤ، تم نے اس اہتمام کی کیا قدر کی!

'فَعَمِيَتْ عَلَيْهِمُ الْاَنْۢبَآءُ' کا مفہوم ٹھیک وہی ہے جو ہم اپنے محاورے میں سٹی بھول جانے سے تعبیر کرتے ہیں۔ یعنی اس وقت سب پر ایسی بدحواسی طاری ہوگی کہ کسی سے کوئی بات بنائے نہیں بنے گی۔

کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے!

'فَهُمْ لَا يَتَسَآءَلُوْنَ' یعنی وہ ایسی حالت سراسیمگی میں گرفتار ہوں گے کہ اس سوال کے جواب کے لیے کسی سے کچھ پوچھ پاچھ بھی نہ کر سکیں گے۔ ایسے اوقات میں مرجع امید لیڈر ہوا کرتے ہیں لیکن ان کا ماجرا اوپر گزر چکا کہ انھیں خود اپنی پڑی ہوگی وہ دوسرے کی کیا خبر لیں گے! یہ مضمون مائدہ کی آیت ۱۰۹ میں بھی گزر چکا ہے۔

فَاَمَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَعَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ مِنَ الْمُفْلِحِيْنَ (۶۷)

اہلِ ایمان کے لیے فلاح کی بشارت

'عَسٰى' جب اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت کے ساتھ آئے تو اس کے اندر، جیسا کہ اس کے محل میں ہم واضح کر چکے ہیں، وعدہ اور بشارت کا مفہوم مضمر ہوتا ہے۔

جو لوگ شرک ہی پر جیے اور مرے ان کا انجام واضح کرنے کے بعد یہ ان لوگوں کو بشارت دی ہے جو ترک و شفاعتِ باطل کے عقیدہ سے توبہ کر کے ایمان و عمل صالح کی زندگی اختیار کر لیں گے۔ فرمایا کہ یہ لوگ توقع ہے کہ فلاح پانے والوں میں سے بنیں۔ یعنی یقین تو انھیں بھی اپنی فلاح کا نہیں کر بیٹھنا چاہیے اس لیے کہ نجات و فلاح جس کو بھی حاصل ہوگی خدا کے فضل ہی سے حاصل ہوگی لیکن توقع کا حق وہ رکھتے ہیں اس لیے کہ خدا غفور رحیم ہے۔

وَرَبُّكَ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ وَيَخْتَارُ ۭ مَا كَانَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ ۭ سُبْحٰنَ اللّٰهِ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ (۶۸)

فرشتوں کی حیثیت

یہاں یَخْتَارُ کے بعد بھی مَا یَشَآءُ برنائے قرینہ محذوف ہے۔ یہ فرشتوں کی طرف اشارہ ہے کہ ان کو بھی خدا ہی نے پیدا کیا ہے اور اگر ان کو اپنا مقرب و برگزیدہ بنایا ہے تو اسی نے بنایا ہے۔ وہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے۔ اَللّٰہُ یَصْطَفِیْ مِنَ الْمَلٰٓئِکَةِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ (الحج: ۷۵) (اللہ منتخب کرتا ہے اپنے رسول فرشتوں میں سے بھی اور لوگوں کے اندر سے بھی) مطلب یہ ہے کہ فرشتوں کو جو برتری باعتبار خلق یا باعتبار تقرب حاصل ہے، وہ خدا ہی کی عطا کردہ ہے۔ اس چیز کی بنا پر ان کو یہ درجہ حاصل نہیں ہو گیا ہے کہ ان کو خدا کی خدائی میں شریک بنا دیا جائے۔ مَا کَانَ لَهُمُ الْخِیَرَةُ ان کو بذاتِ خود کوئی اختیار حاصل نہیں ہے۔ سُبْحٰنَ اللّٰهِ وَتَعٰلٰى عَمَّا یُشْرِكُوْنَ اللہ تعالیٰ اس قسم کی تمام نسبتوں سے پاک اور برتر ہے۔ اگر کسی کو اس کے اختیارات اور اس کی صفات میں شریک بنا دیا جائے تو اس سے اس کی تمام اعلیٰ صفات کی نفی ہو جاتی ہے ـــــ یہاں یہ امر ملحوظ رہے کہ اوپر آیت ۶۴ میں جن شرکا کا ذکر آیا ہے، وہ مشرکین عرب کے تصور کے مطابق، ملائکہ ہی کے زمرہ سے تعلق رکھنے والے تھے اس وجہ سے قرآن نے یہاں فرشتوں کی اصل حیثیت واضح فرما دی کہ ان کو خدا کی مخلوقات میں فی الجملہ برتری تو حاصل ہے لیکن یہ خدا داد ہے۔ ان میں سے کوئی چیز بھی ان کی ذاتی نہیں ہے۔

وَرَبُّكَ یَعْلَمُ مَا تُكِنُّ صُدُوْرُهُمْ وَمَا یُعْلِنُوْنَ (۶۹)

احاطۂ علم الٰہی کی دلیل سے شرک کا ابطال

یہ احاطۂ علم الٰہی کی دلیل سے شرک کا ابطال فرمایا ہے کہ جب تیرا رب ان کے سرّ و علانیہ ہر چیز سے خود اچھی طرح باخبر ہے تو اس کو ضرورت کیا ہے کہ وہ کسی کو اپنا شریک و سہیم بنائے! وہ اپنی مملکت میں دوسروں کو شریک تو جب بنائے جب وہ لوگوں کے احوال و معاملات سے باخبر رہنے کے لیے کسی کا محتاج ہو اور اس کے ہاں کسی کے باب میں کسی کی سفارش کی ضرورت تو جب پیش آئے جب کوئی اس کے علم میں اضافہ کرنے کی پوزیشن میں ہو کہ فلاں کے باب میں نعوذ باللہ خدا کو خبر نہیں ہے، اسے ہے۔ جب اس طرح کی کوئی بات فرض کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے تو فرشتوں کو اس مفروضہ پر پوجنے کے کیا معنی کہ وہ خدا کے ہاں کسی کے لیے تقرب و سفارش کا وسیلہ ہیں!

وَهُوَ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ لَهُ الْحَمْدُ فِی الْاُوْلٰى وَالْاٰخِرَةِ ؗ وَلَهُ الْحُكْمُ وَاِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ (۷۰)

خلاصۂ بحث

یہ اوپر کی ساری بحث کا خلاصہ یک جا کر دیا ہے کہ بس وہی اللہ معبودِ حقیقی ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ اس کے سوا جن کو بھی معبود بنایا گیا ہے سب باطل ہے۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ اللہ کو معبودِ اعظم کی حیثیت سے اہل عرب بھی مانتے تھے لیکن ساتھ ہی اس کے شریک بھی مانتے تھے۔ یہ ان کے شرک کی نفی کر دی۔

لَهُ الْحَمْدُ فِی الْاُوْلٰى وَالْاٰخِرَةِ۔ یعنی دنیا میں بھی جو نعمت انسان کو ملی ہے اللہ تعالیٰ ہی کی طرف

سے ملی ہے اور آخرت میں بھی جو نعمت حاصل ہونے والی ہے وہ اللہ ہی کی طرف سے ملے گی۔ اس وجہ سے اس دنیا میں بھی حمد و شکر کا سزاوار وہی ہے اور آخرت میں بھی وہی حمد و شکر کا سزاوار ہوگا، کسی دوسرے کا اس میں کوئی حصہ نہیں ہوگا۔ آخرت میں اتمام نعمت کے بعد اہل جنت کی زبانوں پر جو ترانۂ حمد جاری ہوگا سورۂ یونس میں اس کا ذکر ہو چکا ہے۔

'وَلَهُ الْحُكْمُ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ' ہر ایک کا فیصلہ اسی کے اختیار میں ہوگا اور سب کی پیشی اسی کے حضور میں ہونی ہے۔ کوئی اور مرجع و مولیٰ بننے والا نہیں ہے۔

قُلْ أَرَأَيْتُمْ إِنْ جَعَلَ اللَّهُ عَلَيْكُمُ اللَّيْلَ سَرْمَدًا إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ مَنْ إِلَٰهٌ غَيْرُ اللَّهِ يَأْتِيكُمْ بِضِيَاءٍ ۖ أَفَلَا تَسْمَعُونَ. قُلْ أَرَأَيْتُمْ إِنْ جَعَلَ اللَّهُ عَلَيْكُمُ النَّهَارَ سَرْمَدًا إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ مَنْ إِلَٰهٌ غَيْرُ اللَّهِ يَأْتِيكُمْ بِلَيْلٍ تَسْكُنُونَ فِيهِ ۖ أَفَلَا تُبْصِرُونَ (۷۱-۷۲)

مخاطب کے مسلّمات سے استدلال

'قُلْ' یہاں سوال کرنے اور پوچھنے کے معنی میں ہے جب سوال بالکل بدیہی نوعیت کا ہو، جس کے جواب میں مخاطب کے لیے کسی اختلاف کی گنجائش نہ ہو تو اتمام حجت کے پہلو سے یہی لفظ زیادہ موزوں رہتا ہے۔ یہ بات مشرکین عرب کو بھی تسلیم تھی کہ آسمان و زمین اور روز و شب کا خالق خدا ہی ہے۔ ان کے اسی مسلمہ کو بنیاد بنا کر سوال فرمایا کہ بھلا بتاؤ تو سہی کہ اگر اللہ تعالیٰ تمہارے اوپر ہمیشہ کے لیے رات ہی کو مسلط کر دے تو تمہارے معبودوں میں سے کوئی ہے جو تمہارے لیے دن کی روشنی نمودار کر سکے! اسی طرح بتاؤ کہ اگر وہ تمہارے اوپر قیامت تک کے لیے دن ہی کو مسلط کر دے تو کیا تمہارے معبودوں میں سے کسی کے اندر یہ بوتا ہے کہ وہ رات کو لا سکے جس میں تم دن کے تھکے ماندے سکون حاصل کرتے ہو! مطلب یہ ہے کہ جب اس کائنات کے ان تصرفات میں، جن پر تمام مخلوقات کے بقاء کا انحصار ہے، تمہارے ان دیویوں دیوتاؤں کو کوئی دخل نہیں ہے تو آخر یہ کس مرض کی دوا ہیں کہ تم نے ان کو خدا کی خدائی میں شریک بنا رکھا ہے!

اسلوب بیان کی بلاغت

یہاں اسلوب بیان کی یہ بلاغت بھی قابل توجہ ہے کہ شب کے ذکر کے بعد تو فرمایا کہ 'أَفَلَا تَسْمَعُونَ' (کیا تم لوگ سنتے نہیں) اور دن کے ذکر کے ساتھ فرمایا کہ 'أَفَلَا تُبْصِرُونَ' (کیا تم لوگ دیکھتے نہیں) یہ اسلوب تصویر حال کے لیے ہے۔ گویا پہلی بات شب کے اندھیرے میں فرمائی جا رہی ہے کہ اگر رات کے اندھیرے میں تمھیں سجھائی نہیں دے رہا ہے تو کیا سنائی بھی نہیں دے رہا ہے تو آخر اس بات کو سنتے کیوں نہیں! اسی طرح دوسری بات گویا دن کی روشنی میں فرمائی جا رہی ہے کہ اس وقت تو پورے دن کی روشنی موجود ہے تو کیا اس روشنی میں بھی تمھیں یہ بدیہی حقیقت نظر نہیں آ رہی ہے!

اس میں یہ بلاغت بھی ہے کہ معقولات کو محسوسات کی حیثیت دے دی گئی ہے جس میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ یہ بدیہیات ہیں جن کو سمجھنے کے لیے زیادہ تأمل و فکر کی ضرورت نہیں ہے، بس یہ کافی ہے کہ آدمی کے کان اور اس کی آنکھیں کھلی ہوں۔ لیکن تمہارا حال تو یہ ہے کہ نہ شب کے سکون میں تمھیں کچھ سنائی دیتا

نہ دن کے اجالے میں کچھ دکھائی دیتا۔

ایک چیز ان آیات میں اور بھی قابلِ توجہ ہے، وہ یہ کہ رات کے ساتھ اس کی صفت 'تَسْكُنُوْنَ فِيْهِ' تو مذکور ہوئی لیکن دن کے ساتھ اس کی کسی صفت کا ذکر نہیں ہوا۔ اس کی وجہ وہی ہے جس کی طرف ہم نے جگہ جگہ اشارہ کیا ہے کہ بعض مرتبہ کلام کے متقابل اجزاء بتقاضائے ایجاز و بلاغت، حذف کر دیے جاتے ہیں۔ یہاں دن کا فائدہ چونکہ بالکل واضح تھا اس وجہ سے اس کو حذف کر دیا۔ آگے والی آیت میں اس حذف کی وضاحت ہو گئی ہے۔

وَمِنْ رَّحْمَتِهٖ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ (۷۳)

خدا کے انعامات کا حق شکر

یعنی یہ رات اور دن کا لانا صرف خدا کے فضل و رحمت ہی کا کرشمہ ہے، کسی اور کا اس میں کوئی دخل نہیں ہے اور تمہارا خدا پر کوئی حق بھی قائم نہیں تھا کہ وہ تمہارے لیے یہ اہتمام کرتا کہ رات آ کر تمہارے لیے راحت و سکون کا بستر بچھائے اور پھر دن طلوع ہو کر تمہارے لیے تلاشِ رزق و فضل کا میدان گرم کرے۔ یہ سب کچھ محض خدا کی رحمت کا ظہور ہے تاکہ تم ان نعمتوں سے فائدہ اٹھاؤ اور اپنے اس رب کے شکرگزار رہو جس نے تمہارے لیے یہ کچھ اہتمام کیا ہے۔ آیت میں 'لِتَسْكُنُوْا' کا تعلق رات سے ہے اور 'وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ' کا تعلق دن سے ہے۔ انسان کسبِ رزق کے لیے جو جدوجہد کرتا ہے اس کو 'ابتغائے فضل' سے تعبیر فرمایا ہے اس لیے کہ خدا کے پیدا کیے ہوئے اسباب و وسائل سے انسان کی ساری جدوجہد اسی کی مرضی کے مطابق ہونی چاہیے۔ اگر کوئی شخص اس کی خلاف ورزی کرتا ہے تو وہ خدا کے دیے ہوئے اسلحہ کو خدا کے خلاف استعمال کرتا ہے اور اس طرح وہ اس کے غضب کو دعوت دیتا ہے۔

وَيَوْمَ يُنَادِيْهِمْ فَيَقُوْلُ اَيْنَ شُرَكَآءِيَ الَّذِيْنَ كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ ۝ وَنَزَعْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِيْدًا فَقُلْنَا هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ فَعَلِمُوْٓا اَنَّ الْحَقَّ لِلّٰهِ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ (۷۴-۷۵)

آخری اتمام حجت

آیت ۷۴، بعینہٖ اس سلسلۂ بحث کے آغاز میں بھی گزر چکی ہے۔ یہاں یہ ایک اور ماجرے کی تمہید کے طور پر آئی ہے۔ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ مشرکوں پر آخری اتمامِ حجت کے لیے یہ بھی کرے گا کہ ہر امت پر اپنے رسولوں کے ذریعہ سے یہ گواہی دلوا دے گا کہ انھوں نے ان کو دینِ توحید کی تعلیم دی تھی، شرک کی تعلیم نہیں دی۔ رسولوں کی اس گواہی کے بعد اللہ تعالیٰ امتوں سے پوچھے گا کہ اب بتاؤ تم نے کس سند کی بنا پر خدا کے شریک ٹھہرائے، اگر تمہارے پاس کوئی دلیل ہے تو اس کو پیش کرو، اس وقت سب پر واضح ہو جائے گا کہ حق بجانب اللہ ہے اور ان کے تمام خود تراشیدہ معبود بالکل بے حقیقت ثابت ہوں گے۔

'شَهِيْد' سے مراد اللہ کے وہ رسول ہیں جو ہر امت کی طرف بھیجے گئے۔ ان کو 'شَهِيْد' کے لفظ سے اس لیے تعبیر فرمایا کہ انھوں نے خدا کے دین کی گواہی اپنی اپنی امتوں پر اس دنیا میں بھی دی ہے اور

آخرت میں بھی وہ گواہی دیں گے کہ انھوں نے خدا کا دین ٹھیک ٹھیک پہنچا دیا تھا، اگر بعد والوں نے اس میں بدعتیں داخل کی ہیں تو یہ ان کی اپنی ذمہ داری ہے، وہ ان سے بری ہیں۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ ہر امت اپنے شرک و بدعت کی تائید میں اپنے رسولوں اور نبیوں ہی کا حوالہ دیتی ہے کہ یہ انہی کی تعلیم ہے جس پر وہ عمل کر رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں کی شہادت کے ذریعہ سے ان پر آخری حجت تمام کر دے گا جس کے بعد کسی کے لیے لب کشائی کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہے گی۔ سورۂ مائدہ کی آیات ۱۱۶-۱۱۷ کے تحت اس شہادت کی تفصیلات گزر چکی ہیں۔ وضاحت مطلوب ہو تو ایک نظر ان پر بھی ڈال لیجیے۔

استاذ امام رحمۃ اللہ علیہ اس آیت کی تاویل مریم کی آیت ۶۹ اور حٰمٓ السجدۃ کی آیت ۴۷ کی روشنی میں کرتے ہیں۔ لیکن مجھے اس پر اطمینان نہیں ہے۔ میں نے جو تاویل کی ہے دوسرے مفسرین کی تاویل بھی یہی ہے اور قرآن کے واضح نظائر اسی کے حق میں ہیں۔ والعلم عند اللہ۔

۶- آگے کا مضمون —— آیات ۷۶-۸۴

آگے کا مضمون اوپر آیت ۵۸ سے مربوط ہو گیا ہے۔ اوپر یہ بیان ہوا تھا کہ اپنی رفاہیت و خوشحالی پر اترانے والی کتنی قومیں گزری ہیں جن کو خدا نے تباہ کر دیا اور ان کو اپنے جن معبودوں پر ناز تھا وہ ان کو خدا کی پکڑ سے نہ بچا سکے۔ اس کے بعد ضمناً ردِ شرک کا مضمون آ گیا جو آیت ۷۵ پر تمام ہوا۔ اس کے بعد پھر اسی اوپر والے مضمون کو از سرِ نو لے لیا اور ایک یہودی سرمایہ دار —— قارون —— کے فخر و غرور اور اس کے عبرت انگیز انجام کو بطور تمثیل ذکر کر کے ان لوگوں کو تنبیہ فرمایا جو دنیا کی زینتوں پر ریجھ کر خدا اور آخرت کو بھلا بیٹھے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم میں قارون کا مماثل ابولہب تھا۔ اس کو بھی اپنی دولت پر بڑا ناز تھا اور اس کی یہ دولت مندی خود اس کے لیے بھی اور دوسرے بہتوں کے لیے بھی فتنہ بنی ہوئی تھی۔ اس تمثیل سے مقصود اسی طرح کے لوگوں کی آنکھیں کھولنا ہے۔ اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۷۶-۸۴

إِنَّ قَارُونَ كَانَ مِن قَوْمِ مُوسَىٰ فَبَغَىٰ عَلَيْهِمْ ۖ وَآتَيْنَاهُ مِنَ الْكُنُوزِ مَا إِنَّ مَفَاتِحَهُ لَتَنُوءُ بِالْعُصْبَةِ أُولِي الْقُوَّةِ إِذْ قَالَ لَهُ قَوْمُهُ لَا تَفْرَحْ ۖ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِينَ ﴿٧٦﴾ وَابْتَغِ فِيمَا آتَاكَ اللَّهُ الدَّارَ الْآخِرَةَ ۖ وَلَا تَنسَ نَصِيبَكَ مِنَ الدُّنْيَا

وَأَحْسِن كَمَا أَحْسَنَ اللَّهُ إِلَيْكَ وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِي الْأَرْضِ إِنَّ
اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِينَ ﴿٧٧﴾ قَالَ إِنَّمَا أُوتِيتُهُ عَلَىٰ عِلْمٍ عِندِي
أَوَلَمْ يَعْلَمْ أَنَّ اللَّهَ قَدْ أَهْلَكَ مِن قَبْلِهِ مِنَ الْقُرُونِ مَنْ هُوَ
أَشَدُّ مِنْهُ قُوَّةً وَأَكْثَرُ جَمْعًا وَلَا يُسْأَلُ عَن ذُنُوبِهِمُ الْمُجْرِمُونَ ﴿٧٨﴾
فَخَرَجَ عَلَىٰ قَوْمِهِ فِي زِينَتِهِ قَالَ الَّذِينَ يُرِيدُونَ الْحَيَاةَ
الدُّنْيَا يَا لَيْتَ لَنَا مِثْلَ مَا أُوتِيَ قَارُونُ إِنَّهُ لَذُو حَظٍّ عَظِيمٍ ﴿٧٩﴾
وَقَالَ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ وَيْلَكُمْ ثَوَابُ اللَّهِ خَيْرٌ لِّمَنْ آمَنَ
وَعَمِلَ صَالِحًا وَلَا يُلَقَّاهَا إِلَّا الصَّابِرُونَ ﴿٨٠﴾ فَخَسَفْنَا بِهِ وَ
بِدَارِهِ الْأَرْضَ فَمَا كَانَ لَهُ مِن فِئَةٍ يَنصُرُونَهُ مِن دُونِ
اللَّهِ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُنتَصِرِينَ ﴿٨١﴾ وَأَصْبَحَ الَّذِينَ تَمَنَّوْا مَكَانَهُ
بِالْأَمْسِ يَقُولُونَ وَيْكَأَنَّ اللَّهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَن يَشَاءُ مِنْ
عِبَادِهِ وَيَقْدِرُ لَوْلَا أَن مَّنَّ اللَّهُ عَلَيْنَا لَخَسَفَ بِنَا وَيْكَأَنَّهُ
لَا يُفْلِحُ الْكَافِرُونَ ﴿٨٢﴾ تِلْكَ الدَّارُ الْآخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِينَ
لَا يُرِيدُونَ عُلُوًّا فِي الْأَرْضِ وَلَا فَسَادًا وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ ﴿٨٣﴾
مَن جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهُ خَيْرٌ مِّنْهَا وَمَن جَاءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا
يُجْزَى الَّذِينَ عَمِلُوا السَّيِّئَاتِ إِلَّا مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿٨٤﴾

ع ۸

ترجمہ آیات ۷۶ - ۸۴

قارون موسیٰ کی قوم میں سے تھا تو اس نے ان کے مقابل میں سر اٹھایا۔ اور ہم
نے اس کو اتنے خزانے دے رکھے تھے جن کی کنجیاں ایک طاقتور جماعت سے مشکل سے

اٹھتی تھیں۔ جب کہ اس کی قوم کے لوگوں نے اس سے کہا کہ اترا مت! اللہ تعالیٰ اترانے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ اور جو کچھ خدا نے تمھیں دے رکھا ہے اس میں آخرت کے طالب بنو اور دنیا میں سے اپنے حصّہ کو نہ بھولو۔ اور جس طرح خدا نے تمھارے ساتھ احسان کیا ہے اسی طرح تم بھی دوسروں کے ساتھ احسان کرو۔ اور زمین میں فساد کے طالب نہ بنو۔ اللہ تعالیٰ فساد چاہنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ ۷۶-۷۷

اس نے جواب دیا کہ مجھے یہ جو کچھ ملا ہے میرے ذاتی علم کی بدولت ملا ہے۔ کیا اس نے یہ نہیں جانا کہ خدا نے اس سے پہلے کتنی ہی قوموں کو ہلاک کر چھوڑا جو قوت میں اس سے بڑھ چڑھ کر اور جمعیت میں اس سے زیادہ تھیں اور مجرموں سے ان کے جرموں کی بابت سوال بھی نہیں کیا جاتا۔ ۷۸

پس وہ پوری شان و شوکت کے ساتھ اپنی قوم کے لوگوں کے سامنے نکلا تو جو لوگ حیاتِ دنیا کے طالب تھے انھوں نے کہا کاش ہمیں بھی وہی کچھ حاصل ہوتا جو قارون کو حاصل ہے، بے شک وہ بڑا ہی نصیبہ ور ہے! اور جن لوگوں کو علم عطا ہوا تھا انھوں نے کہا، شامتِ زدہ! ایمان اور عمل صالح والوں کے لیے خدا کا اجر اس سے کہیں بہتر ہے اور یہ حکمت صرف صابروں ہی کو عطا ہوتی ہے۔ ۷۹-۸۰

بس ہم نے اس کے اور اس کے گھر سمیت زمین کو دھنسا دیا تو نہ اس کے لیے کوئی جماعت ہی ایسی اٹھی جو خدا کے مقابل میں اس کی مدد کرتی اور نہ وہ خود ہی اپنی مدافعت کرنے والا بن سکا۔ اور وہ لوگ جو کل اس کی جگہ کے متمنّی تھے پکار اٹھے کہ لاریب! اللہ ہی اپنے بندوں میں سے جس کے لیے چاہتا ہے رزق کو کشادہ کرتا ہے اور جس کے لیے

چاہتا ہے تنگ کرتا ہے۔ اگر اللہ کا ہم پر فضل نہ ہوا ہوتا تو ہمیں بھی دھنسا دیتا۔ لاریب، کافر فلاح نہیں پائیں گے۔" ۸۱-۸۲

یہ دارِ آخرت ہم انھیں لوگوں کے لیے خاص رکھیں گے جو زمین میں غرور اور فساد کے چاہنے والے نہیں ہیں اور انجام کار کی کامیابی خدا ترسوں ہی کے لیے ہے۔ جو نیکی کما کر لائے گا تو اس کے لیے اس سے بہتر صلہ ہے اور جو بدی کما کر لائے گا تو بدی کمانے والوں کو وہی بدلہ میں ملے گا جو وہ کر کے آئیں گے۔ ۸۳-۸۴

۷۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

إِنَّ قَارُونَ كَانَ مِن قَوْمِ مُوسَىٰ فَبَغَىٰ عَلَيْهِمْ وَآتَيْنَاهُ مِنَ الْكُنُوزِ مَا إِنَّ مَفَاتِحَهُ لَتَنُوءُ بِالْعُصْبَةِ أُولِي الْقُوَّةِ إِذْ قَالَ لَهُ قَوْمُهُ لَا تَفْرَحْ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِينَ (۷۶)

قارون کا حضرت موسیٰؑ پر حسد

قارون کا ذکر تورات کی کتاب گنتی باب ۱۶ میں آیا ہے۔ تورات میں اس کا نام قورح مذکور ہوا ہے، اس کے نسب نامہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حضرات موسیٰؑ و ہارونؑ کے خاندان ـــ بنی لاوی ـــ سے اور رشتہ میں حضرت موسیٰؑ کے سگے چچا کا لڑکا تھا۔ اس کو حضرت موسیٰؑ و حضرت ہارونؑ کی امامت و سیادت کا بڑا حسد تھا اس وجہ سے اس نے یہ نعرہ بلند کیا کہ خاندان کے تمام آدمی یکساں مقدس اور دیندار ہیں تو آخر موسیٰؑ و ہارونؑ (علیہما السلام) ہی کو کیا ایسے سرخاب کے پر لگے ہوئے ہیں کہ وہ قوم کی امامت و پیشوائی کریں۔ دوسروں کو یہ حق کیوں حاصل نہیں ہے! چنانچہ وہ خاندان کے کچھ لوگوں کو ملا کر حضرت موسیٰؑ کے خلاف بغاوت کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ تورات کے الفاظ ملاحظہ ہوں۔

> "اور قورح بن اضہار بن قہات بن لاوی نے بنی روبن میں سے الیاب کے بیٹوں داتن اور ابیرام اور پلت کے بیٹے اون کے ساتھ مل کر اور آدمیوں کو ساتھ لیا اور وہ اور بنی اسرائیل میں سے ڈھائی سو اور اشخاص، جو جماعت کے سردار اور چیدہ اور مشہور آدمی تھے، موسیٰ کے مقابل میں اٹھے اور وہ موسیٰ و ہارون کے خلاف اکٹھے ہو کر کہنے لگے تمہارے تو بڑے دعوے ہو چلے کیونکہ جماعت کا ایک ایک آدمی مقدس ہے اور خداوند ان کے بیچ رہتا ہے سو تم اپنے آپ کو خداوند کی جماعت سے بڑا کیونکر ٹھہراتے ہو۔" (گنتی باب ۱۶: ۱-۳)

اس کی اسی بغاوت کو قرآن نے یہاں 'فَبَغٰی عَلَیْھِمْ' سے تعبیر فرمایا ہے۔

قارون کی دولت مندی

وَاٰتَیْنٰہُ مِنَ الْکُنُوْزِ مَآ اِنَّ مَفَاتِحَہٗ لَتَنُوْٓاُ بِالْعُصْبَۃِ اُولِی الْقُوَّۃِ' یہ اس کی سرمایہ داری اور دولت مندی کا ذکر فرمایا جس سے مقصود اس کی اس سرکشی اور استکبار کے سبب پر روشنی ڈالنا ہے کہ چونکہ وہ بڑا مالدار آدمی تھا اس وجہ سے اس کو یہ بات کھلتی تھی کہ وہ اپنے مقابل میں اپنے خاندان اور اپنی قوم پر حضرات موسیٰؑ و ہارونؑ کی برتری تسلیم کرے۔ فرمایا کہ ہم نے اس کو اتنے خزانے دے رکھے تھے کہ ان کی کنجیاں ایک طاقت ور جماعت سے اٹھتی تھیں۔ یہ کوئی مبالغہ کا اسلوب بیان نہیں ہے بلکہ بیان واقعہ ہے۔ اس زمانے میں خزانوں کی حفاظت کے لیے اس طرح کی تجوریاں، آہنی الماریاں اور سیف نہیں ہوتے تھے جس طرح کے ہمارے زمانے میں ہوتے ہیں اور نہ اس طرح کے صیقل کردہ قفل اور کنجیوں ہی کا رواج تھا جن کا اب ہے۔ اس زمانے کے بڑے سرمایہ دار بالعموم زمین دوز خزانے بناتے اور ان کو محفوظ کرنے کے لیے ان کے پھاٹکوں اور دروازوں میں بڑے بڑے آہنی کنڈے لگا کر ان میں بھاری بھاری آہنی اڑنگے، جو خاص اسی غرض کے لیے تیار کیے جاتے، پھنساتے۔ ان اڑنگوں کو پھنسانا اور ان کو کھولنا دونوں ایک مشکل کام ہوتا اور ان کے تمام لوازم مل ملا کر ایک بھاری بوجھ بن جاتے۔ جب بھی ان کو ہٹانے یا اٹھانے کی ضرورت پیش آتی تو ایک طاقت ور جماعت کی ضرورت ہوتی۔ یہی طریقہ اس زمانے میں شہر پناہوں اور قلعوں کے آہنی دروازوں کو بند کرنے کے لیے بھی اختیار کیا جاتا۔ اس طریقہ کی بعض یادگاریں اب بھی ہماری دیہاتی زندگی میں پائی جاتی ہیں۔ آیت میں اسی طرح کی کنجیوں کی طرف اشارہ ہے۔ عرب میں جس طرح کسی کے پاس بھاری بھاری دیگوں کا پایا جانا اس کی فیاضی کی دلیل تھا اسی طرح اس قسم کی کنجیوں کا پایا جانا اس کی سرمایہ داری کی نشانی تھا۔

قوم کے دانشمندوں کی قارون کو نصیحت

اِذْ قَالَ لَہٗ قَوْمُہٗ الاٰیۃ' جب اس نے سرکشی کی یہ روش اختیار کی تو اس کی قوم کے دانشمند لوگوں نے اس کو سمجھانے کی کوشش کی کہ خدا کی بخشی ہوئی نعمتوں کے غرور میں خدا ہی کے خلاف نہ اکڑو، یاد رکھو کہ خدا اکڑنے اور اترانے والوں کو کبھی پسند نہیں کرتا۔ یہ شائستہ الفاظ میں اس کو تنبیہ تھی کہ یہ روش اختیار کرنے والے بالآخر خدا کی پکڑ میں آجاتے ہیں۔ لفظ قوم اگرچہ عام ہے لیکن قرینہ دلیل ہے کہ اس سے مراد قوم کے اصحاب علم ہیں۔ آگے آیت ۸۰ میں اس کی وضاحت ہوگئی ہے۔ یہاں عام لفظ استعمال کرنے کی وجہ یہ ہے کہ قوم کی اکثریت حضرت موسیٰؑ کے ساتھ تھی صرف تھوڑے سے مفاد پرست تھے جن کو قارون نے اپنے ساتھ ملا کر اپنی پارٹی بنالی تھی۔

وَابْتَغِ فِیْمَآ اٰتٰىکَ اللّٰہُ الدَّارَ الْاٰخِرَۃَ وَلَا تَنْسَ نَصِیْبَکَ مِنَ الدُّنْیَا وَاَحْسِنْ کَمَآ اَحْسَنَ اللّٰہُ اِلَیْکَ وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِی الْاَرْضِ ط اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْمُفْسِدِیْنَ (۷۷)

یہ اسی نصیحت کی مزید تفصیل ہے جو انھوں نے قارون کو کی۔ اس کا ایک ایک فقرہ حکمت و معرفت کا

خزانہ ہے۔

وَابْتَغِ فِیْمَآ اٰتٰىكَ اللّٰهُ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ۔ یعنی خدا نے تمھیں یہ رفاہیت جو بخشی ہے اکڑنے اور اترانے کے لیے نہیں بخشی ہے بلکہ اس لیے بخشی ہے کہ تم اس کو آخرت کی فوز و فلاح حاصل کرنے کا ذریعہ بناؤ۔ مطلب یہ ہے کہ یہ جو کچھ بھی تمھیں حاصل ہے نہ تمھارے اب وجد کی میراث ہے اور نہ تمھاری قابلیت واستحقاق کا کرشمہ ہے بلکہ یہ سرتا سر خدا کی بخشش ہے اور اس کو دے کر خدا نے تمھارا امتحان کیا ہے کہ اس کو پا کر تم اس کے پرستار بن کر بیٹھ جاتے ہو یا اس کو خدا کی خوشنودی و رضا طلبی کا ذریعہ بناتے ہو۔

وَلَا تَنْسَ نَصِیْبَكَ مِنَ الدُّنْیَا۔ یہ نہایت حکیمانہ تنبیہ ہے کہ یاد رکھو کہ اس دنیا کی ہر چیز آنی و فانی ہے۔ اس کی کسی چیز کو بھی بقا نہیں ہے۔ تمھاری ابدی زندگی میں اس میں سے تمھارے کام آنے والی چیز وہی بنے گی جو تم آج خدا کی راہ میں صرف کرو گے۔ اگر تم خدا اور اس کے بندوں کے حقوق سے آنکھیں بند کیے ہوئے سونے اور چاندی کے اس ڈھیر کی پوجا کرتے رہے تو یاد رکھو کہ وبال اور تباہی کے سوا تم اس سے کچھ بھی حاصل نہ کر سکو گے۔

عام طور پر ہمارے مفسرین نے اس کا یہ مطلب لیا ہے کہ تم اس دنیا میں سے بھی اپنا حصہ نظر انداز نہ کرو، ہم یہ نہیں کہتے کہ آخرت کی خاطر اس دنیا کو تج دو بلکہ یہ کہتے ہیں کہ آخرت کو بھی فراموش نہ کرو۔ ہمارے نزدیک یہ بات بالکل غلط ہے اور گوناگوں پہلوؤں سے غلط ہے لیکن صحیح مطلب واضح کر دینے کے بعد اس کی تردید کی ضرورت باقی نہیں رہی۔

وَاَحْسِنْ كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَیْكَ۔ یعنی جس طرح خدا نے تمھارے ساتھ یہ اچھا معاملہ کیا ہے اسی طرح تم بھی دوسروں کے ساتھ اچھا معاملہ کرو۔ خدا اپنی صفات کا عکس اپنے بندوں میں بھی دیکھنا چاہتا ہے۔ یاد رکھو کہ جو خدا مُحسن ہے وہ کبھی ان لوگوں کو پسند نہیں کر سکتا جو اس کے بندوں کے معاملے میں تنگ دل ہوں۔

فساد فی الارض کی حقیقت

وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِی الْاَرْضِ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْمُفْسِدِیْنَ۔ یہ اسی موعظت کی وضاحت اس کے منفی پہلو سے ہے۔ فَسَادِ فِی الْاَرْضِ کی وضاحت ہم اس کتاب میں جگہ جگہ کر چکے ہیں۔ زمین میں فساد صرف چوری رہزنی اور ڈکیتی ہی نہیں ہے۔ یہ تو محض اس کے بعض مظاہر ہیں۔ اصل فساد علو واستکبار ہے۔ استکبار کی حقیقت یہ ہے کہ آدمی اپنے حدودِ بندگی سے تجاوز کر کے خدا کے حدود و حقوق میں مداخلت کرے۔ جو لوگ اس جرم کے مرتکب ہیں وہ مفسدین فی الارض میں شامل ہیں، خواہ وہ یہ کام کتنی ہی دانش فروشیوں کے ساتھ کریں۔ ایسے لوگوں کو خدا پسند نہیں کرتا۔ ظاہر ہے کہ وہ ان لوگوں کو کیسے پسند کر سکتا ہے جو اس کے مقابل میں سر اٹھائیں اور اس کے حرم میں دراز دستی کریں۔ اور جب وہ ان کو پسند نہیں کرتا تو اس کے صاف معنی یہ ہوئے کہ ان کی حیثیت اس کے چمن میں خودرو جھاڑیوں اور اس کے خوانِ کرم پر ناخواندہ مہمانوں

کی ہے۔ بالآخر ایک وقت آئے گا کہ خود رو جھاڑیاں اکھاڑی جائیں گی اور ناپسندیدہ لوگ کھدیڑ دیے جائیں گے!

قَالَ اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِيْ ۭ اَوَلَمْ يَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَهْلَكَ مِنْ قَبْلِهٖ مِنَ الْقُرُوْنِ مَنْ هُوَ اَشَدُّ مِنْهُ قُوَّةً وَّاَكْثَرُ جَمْعًا ۭ وَلَا يُسْـَٔـلُ عَنْ ذُنُوْبِهِمُ الْمُجْرِمُوْنَ (۷۸)

قارون کا جواب

قارون نے جواب دیا کہ یہ مال و متاع جو مجھے حاصل ہے میری حسنِ تدبیر، مہارتِ فن اور قابلیت کا ثمرہ ہے، اس کو خدا سے کیا تعلق کہ اس میں اس کا کوئی حق قائم ہوا اور مجھ پر اس کے ادا کرنے کی ذمہ داری ہوا لفظ 'عندی' سے اس کے ذہن کا یہ مخفی پہلو ظاہر ہوتا ہے کہ اس تمام دولت کا سرچشمہ خود میرے اندر ہے نہ کہ خدا کے اندر اس وجہ سے مجھے اس باب میں خدا یا کسی اور سے کوئی اندیشہ نہیں ہے مطلب یہ ہوا کہ آپ لوگوں کا یہ سارا وعظ میرے آگے بالکل بے سود ہے، یہ وعظ کسی اور کو سنائیے!

اللہ تعالیٰ کی تنبیہ

'اَوَلَمْ يَعْلَمْ الاية' یہ اس کے قول پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے تبصرہ ہے کہ اس بدقسمت نے یہ لاف زنی کرتے ہوئے یہ نہ سوچا کہ اس سے پہلے کتنے گزر چکے ہیں جو قوت و جمعیت میں اس سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہوئے لیکن خدا نے ان کو چشم زدن میں تباہ کر دیا! یہ امر ملحوظ رہے کہ اس سے کچھ ہی پہلے فرعون کے غرق ہونے کا واقعہ پیش آچکا تھا جس کو اگر اس نے دیکھا نہیں تو سنا تو بہرحال ہوگا۔ یہاں 'اَشَدُّ مِنْهُ قُوَّةً' میں اسباب و وسائل، خدم و حشم اور اسلحہ و آلات کی قوت مراد ہے اور 'اَكْثَرُ جَمْعًا' میں 'جمع' سے قبیلہ و خاندان کی جمعیت مراد ہے۔

'وَلَا يُسْـَٔـلُ عَنْ ذُنُوْبِهِمُ الْمُجْرِمُوْنَ' جب خدا اس قسم کے مجرموں کو پکڑنے کا فیصلہ کر لیتا ہے تو پھر ان کو اتنی مہلت بھی نہیں دی جاتی کہ ان سے ان کے جرم کی بابت کچھ پوچھ لیا جائے اور اگر ان کے پاس کوئی جواب ہے تو وہ سن لیا جائے۔ بلکہ اس کا عذاب ان کو فوراً دبوچ لیتا ہے اور قیامت کے دن بھی خدا کو کسی سے اس کے جرائم کی بابت کسی تحقیق و تفتیش کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ ہر مجرم کی پیشانی اس کے ہاتھ پاؤں اور اس کے اعضاء و جوارح خود اس کے خلاف گواہی دیں گے۔ يُعْرَفُ الْمُجْرِمُوْنَ بِسِيْمٰهُمْ فَيُؤْخَذُ بِالنَّوَاصِيْ وَالْاَقْدَامِ (رحمٰن: ۴۱)

فَخَرَجَ عَلٰى قَوْمِهٖ فِيْ زِيْنَتِهٖ ۭ قَالَ الَّذِيْنَ يُرِيْدُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا يٰلَيْتَ لَنَا مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ قَارُوْنُ ۙ اِنَّهٗ لَذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ (۷۹)

قارون کا جلوس اور عوام پر اس کا اثر

معلوم ہوتا ہے اس نے اسی دوران میں اپنے زور و اثر اور اپنی قوت و جمعیت کی نمائش کے لیے کوئی جلوس نکالا تاکہ حضرت موسیٰؑ اور ان کے ساتھیوں کو مرعوب اور اپنی جمعیت میں اضافہ کرے۔ 'فِيْ زِيْنَتِهٖ' کے الفاظ سے یہ بات نکلتی ہے کہ اس موقع پر اس نے اپنی دولت و حشمت کا خاص طور پر مظاہرہ کیا اس لیے کہ عوام کالانعام کو سب سے زیادہ یہی چیز متاثر کرتی ہے۔ یہ بعینہٖ اسی طرح کی حرکت ہے جس

کے تماشے آئے دن آپ کے لیڈر حضرات آپ کے شہروں اور قصبوں میں دکھاتے رہتے ہیں۔ اس کا اثر، ان لوگوں پر جو اسی دنیا کی دولت کو سب کچھ سمجھتے ہیں، یہ پڑا کہ وہ اس کا نعرہ لگانے لگے کہ بے شک قارون بڑا ہی نصیبہ ور ہے!

وَقَالَ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ وَيْلَكُمْ ثَوَابُ اللَّهِ خَيْرٌ لِمَنْ آمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا وَلَا يُلَقَّاهَا إِلَّا الصَّابِرُونَ (۸۰)

قوم کے اہل دانش کا رد [illegible]

قوم میں جو لوگ علم و دانش رکھنے والے تھے انھوں نے لوگوں کو سمجھانے کی کوشش کی کہ اصل چیز مال و دولت اور اس کی نمائش نہیں ہے بلکہ ایمان و عمل صالح اور اس کا اجر و ثواب ہے جس کے لیے انسان کو اپنی زندگی وقف کرنی چاہیے۔ لیکن یہ حکمت ہر ایک کو حاصل نہیں ہوتی، صرف انہی کو حاصل ہوتی ہے جن کے اندر دنیا کی رغبات و مطامع کے مقابل میں ایمان و عمل پر جمے رہنے کی ہمت و عزیمت ہوتی ہے

حقیقی علم خدا کی معرفت اور آخرت کا علم ہے

'اُوْتُوا الْعِلْمَ' میں 'علم' سے مراد علم حقیقی ہے یعنی خدا کی معرفت اور آخرت کا علم۔ یہی علم ہے جس سے انسان کو اصل روشنی حاصل ہوتی ہے۔ اگر یہ علم کسی کو حاصل نہ ہو تو وہ تاریکی میں ہے، اگرچہ وہ دوسرے علوم میں کتنا ہی شاطر ہو۔ قارون مالیات کے فن کا بہت بڑا ماہر تھا اور اوپر واضح ہو چکا ہے کہ اس کو اس فن میں مہارت کا دعویٰ بھی تھا لیکن علم حقیقی سے وہ محروم تھا اس وجہ سے اتنی دولت رکھنے کے باوجود اس کی حیثیت ایک مارِ گنج سے زیادہ نہ بن سکی۔ بالکل یہی حال دوسرے علوم کا بھی ہے۔ وہ بھی انسان کے لیے نافع اسی وقت بنتے ہیں جب اس کو علمِ حقیقی کا نور حاصل ہو۔ اگر اس نور سے وہ محروم ہو تو ان سے وہ چالاک، کاردان اور شاطر تو بن جاتا ہے لیکن انسان نہیں بنتا۔ اور بغیر انسان بنے چالاکی و ہوشیاری نہایت خطرناک چیز ہے۔ یہ نادان کے ہاتھ میں تلوار ہے۔ اس حقیقت کو ہمیشہ یاد رکھیے کہ جہاں تک مجرد چالاکی و ہوشیاری کا تعلق ہے اس فن میں شیطان کسی سے پیچھے نہیں ہے بلکہ وہ تمام چالاکوں کا مرشد و امام ہے۔

حکمت صابروں کو حاصل ہوتی ہے

'وَلَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا الصّٰبِرُوْنَ' میں ضمیر کا مرجع وہ حکمت و موعظت ہے جس کی ان اصحابِ علم نے تلقین فرمائی۔ اس طرح ضمیر لانا عربی میں معروف ہے اور اس کی متعدد مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں۔ اس سے ایک بات تو یہ معلوم ہوئی کہ علم حقیقی اور صبر دونوں بالکل توام ہیں اور دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ اصل حکمت صرف انہی کو حاصل ہوتی ہے جن کے اندر صبر ہو۔ یعنی جو آخرت کی طلب میں اس دنیا کی بڑی سے بڑی دولت و شوکت کو قربان کرنے کی اپنے اندر ہمت رکھتے ہوں۔ جن کے اندر یہ حوصلہ اور ظرف نہ ہو وہ اس حکمت کے حامل نہیں بن سکتے۔

اس ٹکڑے کے متعلق ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ یہ انہی اصحابِ علم کے قول کا جزو ہے یا یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بطور تضمین ان کی تحسین ہے۔ اس بارے میں ابھی جزم کے ساتھ کوئی بات

میں نہیں کہہ سکتا لیکن اس طرف ذہن جاتا ضرور ہے اور قرآن میں اس کی نظیریں بھی موجود ہیں۔ اس صورت میں اس ٹکڑے کا مطلب یہ ہوگا کہ یہ حکمت ان لوگوں کو اس وجہ سے عطا ہوئی کہ یہ صابرین میں سے تھے۔ قارون کی دولت و حشمت اور اس کے طمطراق سے مرعوب ہو کر پھسل جانے والے لوگ نہیں تھے۔

فَخَسَفْنَا بِهٖ وَبِدَارِهِ الْاَرْضَ فَمَا كَانَ لَهٗ مِنْ فِئَةٍ يَّنْصُرُوْنَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۗ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُنْتَصِرِيْنَ (۸۱)

قارون پر حضرت موسیٰ کی لعنت اور اس کا عبرتناک انجام

یہاں قارون کے اس قصہ کا ایک حصہ محذوف ہے۔ تورات سے معلوم ہوتا ہے کہ جب حضرت موسیٰ نے دیکھا کہ سامری کے فتنہ کے بعد ان کی قوم میں ایک اور فتنہ اٹھ کھڑا ہوا ہے تو انھوں نے قارون اور اس کے ساتھیوں کو خیمۂ اجتماع کے سامنے مباہلہ کی دعوت دی تاکہ واضح ہو جائے کہ خدا کی نظروں میں مقبول اور پسندیدہ کون ہے۔ تورات میں اس کی تفصیل طویل ہے۔ ہم صرف اس کا ضروری حصہ یہاں نقل کرتے ہیں۔

اور داتن اور ابیرام اپنی بیویوں، بیٹوں اور بال بچوں سمیت نکل کر اپنے خیموں کے دروازوں پر کھڑے ہوئے۔ تب موسیٰ نے کہا، اس سے تم جان لو گے کہ خداوند نے مجھے بھیجا ہے کہ میں یہ سب کام کروں کیونکہ میں نے اپنی مرضی سے کچھ نہیں کیا۔ اگر یہ آدمی (اشارہ قارون اور اس کے جتھہ کی طرف ہے) ویسی ہی موت مریں جو سب لوگوں کو آتی ہے یا ان پر ویسے ہی حادثے گزریں جو سب پر گزرتے ہیں تو میں خداوند کا بھیجا ہوا نہیں ہوں۔ پر اگر خداوند کوئی نیا کرشمہ دکھائے اور زمین اپنا منہ کھول دے اور ان کو ان کے گھر بار سمیت نگل جائے اور یہ جیتے جی پاتال میں سما جائیں تو تم جاننا کہ ان لوگوں نے خداوند کی تحقیر کی ہے۔ اس نے یہ باتیں ختم ہی کی تھیں کہ زمین ان کے پاؤں تلے پھٹ گئی اور زمین نے اپنا منہ کھول دیا اور ان کو اور ان کے گھر بار کو اور قورح کے ہاں کے سب آدمیوں کو اور ان کے سارے مال و اسباب کو نگل گئی۔ سو وہ اور ان کا سارا گھر بار پاتال میں سما گئے اور زمین ان کے اوپر برابر ہو گئی اور وہ جماعت میں سے نابود ہو گئے اور سب اسرائیلی جو ان کے آس پاس تھے ان کا چلانا سن کر یہ کہتے ہوئے بھاگے کہ کہیں زمین ہم کو بھی نہ نگل لے۔ (گنتی باب ۱۶: ۲۸ - ۳۴)

اس سے معلوم ہوا کہ قارون اور اس کے ساتھیوں کے زمین میں دھنسائے جانے کا واقعہ حضرت موسیٰ کی لعنت اور بددعا کے نتیجے میں ظہور میں آیا۔ اور اس طرح پیش آیا کہ نہ قارون اپنی مدافعت میں کچھ کر سکا اور نہ اس کا وہ جتھہ اس کے کچھ کام آسکا جس کے بل پر اس نے حضرت موسیٰ کا مقابلہ کرنا چاہا تھا۔

وَاَصْبَحَ الَّذِيْنَ تَمَنَّوْا مَكَانَهٗ بِالْاَمْسِ يَقُوْلُوْنَ وَيْكَاَنَّ اللّٰهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَيَقْدِرُ ۚ لَوْلَآ اَنْ مَّنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا لَخَسَفَ بِنَا ۭ وَيْكَاَنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ (۸۲)

عوام کی زودِ پشیمانی

خام ذہن کے لوگ کسی کو بااقتدار یا دولت مند دیکھتے ہیں تو اس پر رشک سے مرنے لگتے ہیں۔ سمجھتے ہیں کہ اس کا یہ اقتدار اور اس کی یہ دولت لازوال ہے۔ ان کو لاکھ سمجھائیے کہ یہ چیزیں عارضی و فانی ہیں لیکن یہ بات کسی طرح ان کے دل میں نہیں اترتی البتہ جب وہ چاروں شانے چت گرتا ہے تب ان کو ناصحوں کی باتیں یاد آتی ہیں اور وہ بھی پکار اٹھتے ہیں کہ ہاں بھائی! ٹھیک کہا تھا جس نے کہا تھا کہ اللہ ہی کے اختیار میں سب کا رزق وفضل ہے، وہی جس کو چاہتا ہے زیادہ دیتا ہے، جس کو چاہتا ہے کم دیتا ہے۔ یہی حال قارون کے طمطراق پر فریفتہ ہونے والوں کا بھی ہوا۔ انھوں نے بھی جب اس کا انجام دیکھا تو بول اٹھے کہ یہ اللہ کا بڑا احسان ہوا کہ ہم اس کے ساتھی نہ بنے ورنہ ہمارا بھی وہی حشر ہوتا جو اس کا اور اس کے ساتھیوں کا ہوا۔ ان لوگوں کی بات سچی نکلی جو کہتے تھے کہ کافروں کو فلاح حاصل نہیں ہوتی!

'اَمس' کا محلِ استعمال

لفظ 'امس' فصیح عربی میں صرف گزرے ہوئے کل کے لیے نہیں آتا بلکہ ماضی قریب کے مفہوم میں بھی آتا ہے۔ جس طرح ہم اپنی زبان میں بولتے ہیں "یہ تو کل کی بات ہے" 'کل' بھی یہ اسی مفہوم میں ہے یعنی ابھی کل تک جو لوگ قارون کی شان و شوکت پر مرتے تھے وہ یہ کہنے لگے۔

'وَی' کا محلِ استعمال

'وَیْ کَاَنَّ' میں 'وَیْ' تنبیہ کا کلمہ ہے۔ جس طرح ہم اپنی زبان میں ارے کہتے ہیں اسی طرح عربی میں 'وَیْ' ہے۔ اس کے ساتھ جب 'کَاَنَّ' یا 'کَاَنَّهٗ' مل جائے تو اس کا مفہوم یہ ہو گا کہ ارے! یہ تو گویا کہ وہی بات ہوئی:......'

'یَقْدِرُ' کے بعد 'لِمَنْ یَّشَآءُ' تقابل کے معروف اصول کے مطابق حذف ہو گیا ہے۔ ہم نے ترجمہ میں اس کو کھول دیا ہے۔

قارون اور ابولہب میں مماثلت کے بعض پہلو

اوپر ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ قارون کی یہ حکایت محض ماضی کی ایک حکایت کی حیثیت سے نہیں بیان ہوئی ہے بلکہ اس کے پردے میں ابولہب اور اس کے ساتھیوں کا کردار اور انجام پیش کیا گیا ہے۔ جس قسم کا فتنہ حضرت موسیٰ کی قوم میں قارون تھا اسی قسم کا فتنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم میں ابولہب تھا یہاں زیادہ تفصیل کا موقع نہیں ہے لیکن دونوں کی مماثلت کے بعض پہلوؤں کی طرف ہم اشارہ کریں گے تاکہ اس قصہ کی اصلی حکمت واضح ہو سکے۔

(۱) جس طرح قارون حضرت موسیٰ کے خاص خاندان ـــ بنی لاوی ـــ کا سب سے بڑا دولت مند تھا اسی طرح ابولہب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان ـــ بنی ہاشم ـــ میں سب سے بڑا دولت مند تھا۔ رشتہ کے اعتبار سے بھی دونوں میں بڑی مماثلت تھی۔ ابولہب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا چچا تھا اور قارون، اوپر ہم اشارہ کر چکے ہیں، حضرت موسیٰ کا برادر عم زاد تھا۔

(۲) دونوں بڑے اونچے درجے کے سرمایہ دار تھے۔ قارون کی دولت مندی کا ذکر اوپر گزر چکا ہے۔ ابولہب کی دولت کا ذکر ان شاء اللہ سورۂ ہمزہ اور سورۂ لہب کی تفسیر میں آئے گا۔ ابولہب خانہ کعبہ کا کلید بردار

اور دوارہ کے پورے خزانے پر تنہا قابض و متصرف تھا۔ اس طرح اس نے حرام و حلال کے تمام راستوں سے بے شمار دولت اکٹھی کر لی تھی۔

(۳) دونوں نہایت بخیل، متکبر اور قسی القلب تھے۔

(۴) اپنے اپنے رسولوں کے ساتھ دونوں کے عناد کی نوعیت بھی ایک ہی تھی۔ قارون یہ چاہتا تھا کہ خاندان کی مذہبی پیشوائی اسے حاصل رہے تاکہ اس کی سرمایہ داری پر کوئی آنچ نہ آئے۔ ابولہب بھی یہی چاہتا تھا کہ خانہ کعبہ کی کلید برداری اور رفادہ کی دولت پر اس کا قبضہ رہے، اس سے لے کوئی محروم نہ کرنے پائے۔

(۵) انجام کے اعتبار سے بھی دونوں میں بڑی مماثلت ہے۔ دونوں خدا کے قہر و غضب کے ہدف ہوئے۔ قارون کا انجام اوپر بیان ہو چکا ہے۔ ابولہب کا انجام ان شاء اللہ، سورۂ لہب کی تفسیر میں تفصیل سے بیان ہوگا۔

اس تفصیل سے واضح ہوا کہ یہاں قارون کے پردے میں درحقیقت، ابولہب اور ابولہب پرستوں کا ذکر ہوا ہے۔ جب تک قرآن میں بیان کردہ واقعات کا یہ پہلو سامنے نہ ہو اس وقت تک ان کی اصلی حکمت واضح نہیں ہوتی۔

تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا ۭ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ (۸۳)

اوپر کی موعظت کا خلاصہ

یہ اوپر کی بیان کردہ موعظت کا خلاصہ سامنے رکھ دیا ہے کہ یہ دارِ آخرت جس کا ذکر ہوا، ہم نے ان لوگوں کے لیے خاص کر رکھا ہے جو خدا کی زمین میں استکبار اور فساد کے طالب نہیں بنیں گے بلکہ اس کے بندے بن کر زندگی بسر کریں گے اور اس کے اندر اس نظامِ حق و عدل کے حامی و علم بردار ہوں گے جس کو خدا نے پسند فرمایا ہے۔ یہی لوگ متقی ہیں اور انجام کار فوز و فلاح ان متقیوں ہی کے لیے ہے۔ نَجْعَلُهَا یہاں خاص کرنے کے مفہوم میں ہے اور یہ بات، فحوائے کلام سے واضح ہے کہ اصل متقی وہی لوگ ہیں جن کے سینے استکبار سے اور جن کے اعمال فساد سے پاک ہوں۔

مَنْ جَاۗءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ خَيْرٌ مِّنْهَا ۚ وَمَنْ جَاۗءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزَى الَّذِيْنَ عَمِلُوا السَّيِّاٰتِ اِلَّا مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (۸۴)

نیکوں کے ساتھ فضل اور بدوں کے ساتھ عدل کا معاملہ

یہ وہ اصول بیان فرما دیا جس کے مطابق آخرت میں نیکوں اور بدوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ معاملہ کرے گا۔ فرمایا کہ جو نیکی کی کمائی کر کے آئیں گے ان کے ساتھ تو اللہ تعالیٰ اپنے فضل کے مطابق معاملہ کرے گا، ان کو ان کی نیکیوں سے کہیں بہتر صلہ دے گا۔ اور جو بدی کی کمائی کر کے آئیں گے ان کے ساتھ اپنے عدل کے مطابق معاملہ کرے گا۔ جو کچھ انھوں نے کیا ہوگا اس کا ثمرہ ان کے آگے رکھ دیا جائے گا کہ یہ تمھاری اپنی ہی لوئی ہوئی فصل کا حاصل ہے، اب اس کا مزا چکھو!

۸۔ آگے کا مضمون ——— آیات ۸۵-۸۸

خاتمۂ سورہ

آگے خاتمۂ سورہ کی آیات ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ اس قرآن کو تم نے خدا سے مانگ کر تو اپنے اوپر اتروایا نہیں ہے کہ اس کی فکر میں گھلے جا رہے ہو۔ جس خدا نے تم پر اس کو اتارا ہے وہی اس کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ کرنے میں تمھارا مددگار ہے۔ وہ تم کو بہر حال کامیابی کی منزل تک پہنچائے گا۔ تو تم ان مخالفین کی ذرا پروا نہ کرو۔ اپنی دعوت پر جمے رہو۔ یہ کتنا ہی زور لگائیں لیکن تم اپنے موقف میں ذرا بھی تبدیلی یا نرمی نہ آنے دو۔ اللہ تمھارے ساتھ ہے ——— آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۸۵-۸۸

إِنَّ الَّذِي فَرَضَ عَلَيْكَ الْقُرْآنَ لَرَادُّكَ إِلَىٰ مَعَادٍ ۚ قُل رَّبِّي أَعْلَمُ مَن جَاءَ بِالْهُدَىٰ وَمَنْ هُوَ فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ﴿٨٥﴾ وَمَا كُنتَ تَرْجُو أَن يُلْقَىٰ إِلَيْكَ الْكِتَابُ إِلَّا رَحْمَةً مِّن رَّبِّكَ ۖ فَلَا تَكُونَنَّ ظَهِيرًا لِّلْكَافِرِينَ ﴿٨٦﴾ وَلَا يَصُدُّنَّكَ عَنْ آيَاتِ اللَّهِ بَعْدَ إِذْ أُنزِلَتْ إِلَيْكَ ۖ وَادْعُ إِلَىٰ رَبِّكَ ۖ وَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ﴿٨٧﴾ وَلَا تَدْعُ مَعَ اللَّهِ إِلَٰهًا آخَرَ ۘ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ ۚ كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ ۚ لَهُ الْحُكْمُ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ﴿٨٨﴾

وقف لازم

ع ۹ / ۶ / ۱۲

ترجمۂ آیات ۸۵-۸۸

بے شک جس نے تم پر قرآن کی ذمہ داری ڈالی ہے وہ تمھیں ایک اچھے انجام تک پہنچا کے رہے گا۔ کہہ دو کہ میرا رب خوب جانتا ہے کہ کون اللہ کی ہدایت لے کر آیا ہے اور کون ہے جو کھلی ہوئی گمراہی میں ہے۔ ۸۶

اور تم تو متوقع نہ تھے کہ تم پر کتاب اتاری جائے، یہ تو بس تمھارے رب کا فضل ہوا ہے اور تم ان کافروں کے پشت پناہ نہ بنو۔ اور یہ تم کو اللہ کی آیات سے روکنے نہ پائیں جب کہ وہ تمھاری طرف اتاری جا چکی ہیں اور تم اپنے رب کی دعوت دو اور مشرکوں میں سے

نہ بنو اور اللہ کے ساتھ کسی اور معبود کو نہ پکارو۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اس کی ذات کے سوا ہر چیز فانی ہے۔ فیصلہ اسی کے اختیار میں ہے اور تم سب اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔ ۸۶۔ ۸۸

---

۹ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

اِنَّ الَّذِیْ فَرَضَ عَلَیْكَ الْقُرْاٰنَ لَرَآدُّكَ اِلٰی مَعَادٍ ؕ قُلْ رَّبِّیْۤ اَعْلَمُ مَنْ جَآءَ بِالْهُدٰی وَ مَنْ هُوَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ (۸۵)

آنحضرت کو شاندار کامیابی کی بشارت

'معاد' کے معنی مرجع، نہایت اور انجام کار کے ہیں۔ اس کی تنکیر یہاں تفخیم شان پر دلیل ہے اس وجہ سے یہ 'مَعَادٍ حَسَن' کے مفہوم میں ہوگا یعنی شاندار انجام اور اعلیٰ مرجع۔

اوپر کے مباحث کے بعد بطور خلاصۂ بحث آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی کہ تم ان مخالفوں کی مخالفت کی ذرا پروا نہ کرو۔ جس نے تمہارے اوپر اس قرآن کی ذمہ داری ڈالی ہے وہ اس کے فرائض کی ادائیگی کی راہ میں ہر قدم پر تمہاری مدد فرمائے گا اور دنیا و آخرت دونوں میں تمھیں شاندار انجام سے ہم کنار کرے گا۔

'لَرَآدُّكَ' کے اندر ایک فیصلہ حتمی وقطعی کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ یعنی یہ بات علی رغم اعداء ہو کے رہے گی۔ جس طرح خدا نے اپنے تمام رسولوں کو فائز المرام کیا اسی طرح تمھیں بھی فائز المرام کرے گا۔ رسولوں کے معاملے میں اللہ تعالیٰ کی جو سنت ہے وہ بالکل اٹل ہے۔

'قُلْ رَّبِّیْۤ اَعْلَمُ مَنْ جَآءَ بِالْهُدٰی وَ مَنْ هُوَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ' یعنی اب اپنے ان مخالفین سے بحث بند کرو اور ان سے یہ آخری بات کہہ دو کہ خدا خوب جانتا ہے کہ کون اللہ کی ہدایت لے کر آیا ہے اور کون کھلی ہوئی گمراہی میں پڑا ہوا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جہاں تک افہام و تفہیم کا تعلق ہے تم نے اپنا فرض ادا کر دیا۔ اب معاملہ اللہ کے حوالے کرو۔ وہی فیصلہ فرمائے گا کہ کون ہدایت پر ہے اور کون گمراہی پر۔ 'الْهُدٰی' سے مراد ہدایت الٰہی ہے۔ اس کی وضاحت ہم اس کے محل میں کر چکے ہیں۔ خدا کی ہدایت کے بعد اگر کوئی شخص گمراہی میں پڑا رہے تو وہ ایک کھلی ہوئی گمراہی میں ہے۔ جس طرح کوئی شخص پورے دن کی روشنی میں بھٹکتا پھرے۔

وَ مَا كُنْتَ تَرْجُوْۤا اَنْ یُّلْقٰۤی اِلَیْكَ الْكِتٰبُ اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ ظَهِیْرًا لِّلْكٰفِرِیْنَ (۸۶)

[illegible]

یہ اوپر والے مضمون ہی کی مزید وضاحت ہے کہ تم نے یہ کتاب اپنے اوپر خدا سے مانگ کر نہیں اتروائی

نہیں ہے کہ اس کی ساری ذمہ داری خدا تم پر ڈال کر اس سے بے تعلق ہو جائے۔ یہ تو تمھارے رب کی رحمت ہے جو اس نے تم پر تمھاری طلب و تمنا کے بغیر، نازل فرمائی ہے تو جس کام کے لیے اس نے تمھیں خود منتخب فرمایا ہے وہی اس کے حقوق و فرائض سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ہر گام پر تمھاری رہنمائی بھی فرمائے گا اور چونکہ یہ رحمت ہے، کوئی زحمت نہیں ہے اس وجہ سے بہرحال اس کا انجام تمھارے حق میں بھی اور ان لوگوں کے حق میں بھی جو اس کو قبول کریں گے، رحمت ہی کا باعث ہوگا۔ اگر ناشکرے لوگ اس کی ناقدری کر رہے ہیں تو وہ اپنے ہی کو خدا کی رحمت سے محروم کر رہے ہیں۔

قریش کو بالواسطہ تنبیہ

فَلَا تَكُونَنَّ ظَهِيرًا لِّلْكَافِرِينَ: یہ خطاب اگرچہ ظاہر الفاظ کے اعتبار سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے لیکن اس میں جو تنبیہ و عتاب مضمر ہے اس کا رخ مکذبین قرآن کی طرف ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو چیز تمھیں خدا کی طرف سے ملی ہے اس کو بے کم و کاست لوگوں تک پہنچا دو۔ اگر وہ تمھیں کچھ دبانا اور نرم کرنا چاہتے ہیں تو تم اس میں کسی تبدیلی یا مداہنت کے مجاز نہیں ہو۔ تم خدا کے آگے مسئول ہو، ان کے آگے مسئول نہیں ہو۔ اگر ان کی خاطر سے تم نے کوئی مداہنت کی تو تم مجرموں کے مددگار اور پشت پناہ بن جاؤ گے۔ یہ قریش کے لیڈروں کو سنا کر اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو متنبہ کر دیا تاکہ اگر وہ اپنے دل کے کسی گوشے میں یہ امید دبائے بیٹھے ہوں کہ ان مخالفتوں سے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کچھ نرم کر لیں گے تو اس سے آخری درجے میں مایوس ہو جائیں۔

نبوت ایک موہبت ربانی ہے

اس آیت سے ایک بات تو یہ معلوم ہوئی کہ نبوت و رسالت ایک موہبت ربانی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی جس کو چاہتا ہے اس کارِ خاص کے لیے منتخب فرماتا ہے اور وہی، جس کو منتخب فرماتا ہے اس کی تربیت فرماتا ہے۔ نبی کو یہ منصب بغیر کسی طلب و تمنا اور کسی انتظار و توقع کے ملتا ہے اور خدا ہی اس منصب کی ذمہ داریوں کے ادا کرنے میں اس کی مدد فرماتا ہے۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ انسانی فطرت کی مضمر صلاحیتوں ہی کا ایک ظہور ہے ان کا خیال بالکل غلط ہے ـــ انشاء اللہ اس مسئلہ پر تفصیلی بحث آخری گروپ کی سورتوں میں آئے گی۔

جو عہدہ اللہ بغیر کسی تمنا کے کسی کو دیتا ہے اس میں وہ اس کی مدد فرماتا ہے۔

دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ آدمی پر اگر کسی منصب و عہدہ کی ذمہ داریاں اس کی طلب و تمنا کے بغیر عائد ہوتی ہیں تو اللہ تعالیٰ اس میں اس کی مدد فرماتا ہے اور اگر وہ کسی عہدہ کا طالب بن کر اس کو حاصل کرتا ہے تو خدا اس کو اس کے عہدہ کے حوالے کر دیتا ہے۔ اس بات کی وضاحت احادیث میں بھی نہایت مؤثر انداز میں ہوئی ہے۔

قرآن کے معاملہ میں مداہنت کرنے والا مجرموں کا ساتھی ہے

تیسری بات یہ معلوم ہوئی کہ قرآن کے معاملے میں ہمیں ہرگز کسی نرمی و مداہنت کو گوارا نہیں کرنا چاہیے۔ اگر ہم ایسا کریں گے تو ہم مجرموں کے ساتھی اور ان کے مددگار بن جائیں گے۔

وَلَا يَصُدُّنَّكَ عَنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ بَعْدَ اِذْ اُنْزِلَتْ اِلَيْكَ وَادْعُ اِلٰى رَبِّكَ وَلَا تَكُوْنَنَّ

مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ (۸۷)

مشرکین کو جو چیز سب سے زیادہ چڑتی اس پر سب سے زیادہ زور

یہ اسی اوپر والے مضمون کی وضاحت مزید تاکید کے ساتھ ہے کہ خواہ یہ مخالفین کتنا ہی زور لگائیں لیکن یہ اللہ کی آیات سے تمھیں روکنے نہ پائیں۔ یہ جن باتوں سے چڑتے ہیں ان کو برملا کہو اور ڈنکے کی چوٹ کہو۔ خدا کی جو بات تم پر نازل ہو چکی ہے اب نہ وہ واپس ہو سکتی اور نہ دبائی جا سکتی۔ اب اس کے بلاغ کی ذمہ داری تم پر عائد ہو چکی۔ خدا کی بات کے ہوتے اس سے انحراف ہلاکت کی راہ پر چلنا ہے۔

'وَادْعُ اِلٰی رَبِّكَ وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ' اپنے رب کی طرف لوگوں کو بلاؤ اور مشرکین میں سے نہ بنو۔ یہ خطاب بھی اسی طرح کا ہے جس طرح کا خطاب اوپر کی آیت میں گزر چکا ہے۔ یہاں یہ امر ملحوظ رہے کہ قریش کے لیڈروں کو سب سے زیادہ چڑ دعوتِ توحید سے تھی اس وجہ سے سب سے زیادہ زور اسی پر دیا اور ساتھ ہی یہ تنبیہ بھی فرما دی کہ اگر تم ان لوگوں کی مخالفت سے مرعوب ہو کر توحید کی دعوت میں کوئی مداہنت کی روش اختیار کرو گے تو تم بھی مشرکین ہی سے بن جاؤ گے۔

وَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ م لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ قف كُلُّ شَیْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ ط لَهُ الْحُكْمُ وَاِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ (۸۸)

مداہنت کے ہر امکان کا سدباب

یہ آخر میں اسی بات کی مزید وضاحت فرما دی کہ مداہنت کے ہر امکان کا سدباب ہو جائے۔ فرمایا کہ اللہ کے ساتھ کسی اور معبود کو نہ پکارو، معبود صرف وہی ہے اس کے سوا کوئی اور معبود نہیں۔ اس کی ذات کے سوا ہر چیز فانی ہے۔ فیصلہ کا تمام اختیار اسی کے ہاتھ میں ہے اور قیامت کے دن سب کی واپسی اسی کی طرف ہونی ہے۔ کوئی اور مولیٰ و مرجع نہیں ہے۔

بتوفیق ایزدی آج بروز جمعۃ المبارک ۱۰ بجے دن اس سورہ کی تفسیر اختتام کو پہنچی۔ فالحمد للہ علی ذٰلک۔

رحمان آباد

۲۹ مارچ ۱۹۷۴ء